نگار - اپر

نگار

قیمت فی کاپی ۱۰ر

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے و ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔

قیمت تین روپیہ

علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جسمیں حسن زبان قدرت بیان اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئیگا ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے

قیمت چار روپیہ

علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جسمیں تاریخ اور انشار لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں، حضرت نیاز کی انشار نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ

علاوہ محصول

مختارات نیاز

حضرت نیاز فتحپوری کے افسانوں کا چوتھا مجموعہ، اس میں اکثر و بیشتر وہ وہ افسانے شامل ہیں جو دوسری زبانوں سے لئے گئے ہیں اور اپنی دلچسپی و افادیت کے لحاظ سے خاص درجہ رکھتے ہیں۔ اس مجموعہ کے مطالعہ سے آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ دوسرے زبانوں کے افسانے کیونکر اپنی زبان میں لینا چاہئے کہ وہ ترجمہ نہ معلوم ہوں، مجلد نہایت عمدہ طباعت و کاغذ و نفیس گرد پوش کے ساتھ قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ

مکتوبات نیاز

دو حصوں میں

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشار میں بالکل نیلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں، اس اڈیشن میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کر دیا گیا ہے اور ۲۲ پونڈ کاغذ پر طباعت ہوا ہے۔

قیمت ہر حصہ تین روپیہ

علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان و تخیل اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشار عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ

علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا

شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا اڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مجموعۂ استفسار و جواب

(حصہ ۲ - ۳)

اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بے کار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان دونوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اور اس کی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلوپیڈیا کی ہے۔

قیمت فی جلد تین روپیہ

علاوہ محصول

جھانسی کی رانی

نیاز فتحپوری کے قلم سے اس ڈرامہ سے نہ صرف ۱۸۵۷ء کے ان واقعات پر روشنی پڑتی ہے جو ہندوستان میں برطانوی راج کے قیام کا باعث ہوئے، بلکہ راجاؤں کے ان اندرونی اختلافات کا بھی حال معلوم ہوتا ہے جو ملک کو غیر ملکیوں کے ہاتھ میں دیدینے کا بڑا سبب تھے اس ڈرامہ کے وہ حصے خصوصیت کے ساتھ بہت دلچسپ ہیں جن میں رانی کی زندگی کے آخری لمحات کا حال بیان کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپیہ چار آنہ

اصحاب کہف

یہ ڈرامہ ایک معری انشار پرداز "توفیق الحکیم" کی کتاب "اہل الکہف" کا ترجمہ ہے۔ جس میں فاضل مصنف نے نہایت لطیف انداز سے "اصحاب کہف" کی روایت پر عاقلانہ تبصرہ کیا ہے، اس تمثیل کی جان وہ حصہ ہے جہاں موضوع محبت پر گفتگو کی گئی ہے اور اس کی ابدیت کو بالکل انوکھے انداز سے پیش کیا گیا ہے۔

ترجمہ حضرت نیاز نے کیا ہے۔

قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ

زیب دیتا ہے اسے جسقدر اچھا کہئے

مرزا غالب نے یہ مصرع بادشاہ کے ہاتھ میں
چکنی ڈلی دیکھ کر کہا تھا مگر دنیا آجکل اسے

نکٹائی مارکہ

بال استعمال کرکے پڑھتی ہے

ہر قسم کا زردہ، مشکی قوام، دانہ الائچی، تیل، عطر، عرق کیوڑہ و گلاب اور مختلف قسم
کے پان مسالوں کو مشرقی نفاست اور طبی احتیاط کے ساتھ طیار کرنے والا
مشرقی ہندوستان کا قدیم ترین کارخانہ آپ کی فرمائشات کا منتظر ہے
فہرست طلب فرمائیے

ٹیلی گرام: "مشکی قوام ہوڑہ"
ٹیلی فون: "ہوڑہ ۴۵۵"

نکٹائی برانڈ زردہ فیکٹری - ۱۴۱ ہوڑہ روڈ ہوڑہ

فاسد مادہ کے بغیر
جراثیم مرض پیدا نہیں کر سکتے

خون صاف رکھنا نہایت ضروری ہے

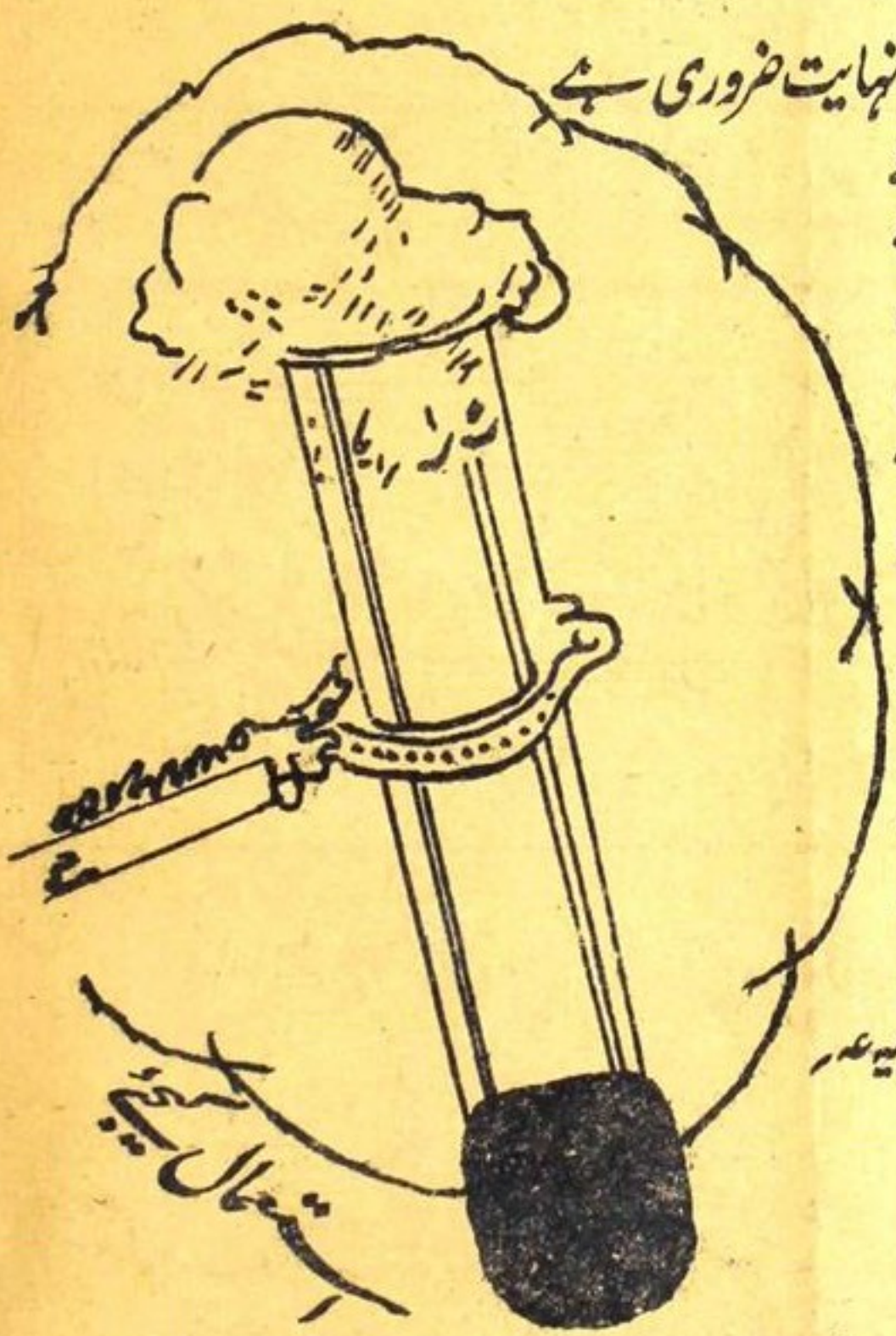

قدیم یونانی نظریہ کی تائید میں جب ڈاکٹر اسپیکوفر پروفیسر ویانا یونیورسٹی نے فیصلہ کر لیا کہ مادہ کے بغیر جراثیم مرض پیدا نہیں کر سکتے تو ایک دن انھوں نے ایک عجیب و غریب مظاہرہ کیا وہ کلاس پڑھا رہے تھے، اُنکے ہاتھ میں ایک ٹیسٹ ٹیوب تھی جس میں ہیضہ کے زندہ جراثیم موجود تھے جو ایک پوری رجمنٹ کو ہلاک کرنے کے لئے کافی تھے۔ ڈاکٹر نے ان سب جراثیم کو نگل لیا، مگر اس خطرناک تجربہ کا نتیجہ سوائے ہلکی سی تکلیف کے اور کچھ نہ ہوا، آخر کیوں؟ ہیضہ کے زندہ جراثیم نے ڈاکٹر کو ہلاک کیوں نہیں کر ڈالا! صرف اس لئے کہ ڈاکٹر کا خون فاسد مادوں سے صاف تھا اور یہی ڈاکٹر کا دعویٰ تھا

یقیناً جراثیم کو مارنا قطعاً غلط ہے اصل چیز جسم و خون کو فاسد مادوں سے صاف رکھنا ہے۔ صافی اسی اُصول کے پیش نظر طیار کی گئی ہے۔ خون کو صاف رکھتی ہے اور جسم کی قوت مدافعت کو مرض کے خلاف قوی رکھتی ہے۔

قیمت فی شیشی ایک روپیہ عہ

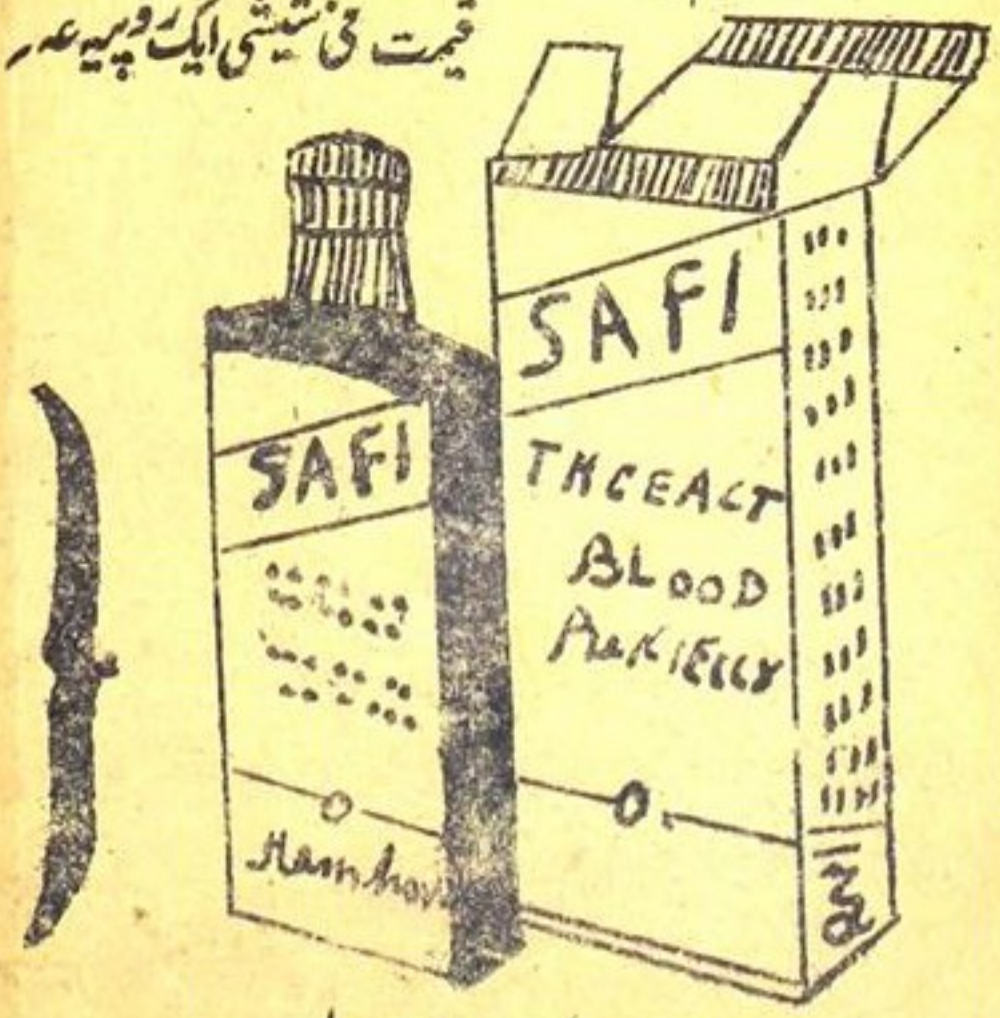

صافی

Hamdard

ہمدرد دواخانہ دہلی

خون صاف کرنے کی قدرتی دوا

نگار

سالانہ چندہ: چھ روپیہ ہندوستان کے لئے — بیرون ہند کے لئے بارہ روپیہ

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۵۳ | مضامین اپریل ۴۸ء | شمار ۴

ملاحظات ---------- ۳

ادب میں نفسیات ---- حنیف فوق ---- ۹

مارشل پلان کی حقیقت ---------- ۱۶

انشاء کے دیگر اصنافِ سخن -- رحمت نبی خاں ام-اے - ۲۰

فلسطین اور تحریک صیہونت ---------- ۳۰

دیوان ذوق میں مولانا آزاد کے اضافے - پروفیسر محمود شیرانی (مرحوم) ۳۴

اُردو زبان ---- عبدالمالک آروی --- ۴۳

باب الانتقاد (روپ میری نظر میں) اثر لکھنوی -- ۴۸

مہاتما گاندھی (نظم) -- جمیل مظہری ام-اے -- ۵۶

انتخاب کلام اثر لکھنوی ---------- ۵۹

ملاحظات

حکومت ہند کا تشویشناک مستقبل

ہندوستان میں تین سیاسی جماعتیں ہیں، ایک کانگرس، دوسری سوشلسٹ، تیسری کمیونسٹ اور مقصود کے لحاظ سے ان تینوں میں کوئی فرق نہیں۔ ملک کی آزادی و ترقی ہمیشہ سے ان تینوں جماعتوں کا نصب العین رہا ہے اور ہے، لیکن چونکہ راہِ عمل تینوں کی مختلف ہے، اس لئے یہ ایک دوسرے سے علٰحدہ ہیں۔

ان میں کانگرس بہت مضبوط جماعت ہے اور اس کا ادارہ بھی کافی وسیع ہے، یہاں تک کہ اسوقت مرکز اور صوبوں میں حکومت بھی اس کی ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ باقی دو جماعتیں ختم ہو چکی ہیں اور اُنکے اُبھرنے کا کوئی امکان نہیں — موجودہ حکومت کے طرزِ عمل کے خلاف ایک سے زاید بار ملک میں آوازیں بلند ہوئی ہیں اور کانگرس حکومت اچھی طرح سمجھتی ہے کہ کسی نہ کسی دن اس کو دوسری جماعتوں کے مقابلہ میں آنا ضروری ہے اور حالات بتا رہے ہیں کہ مقابلہ کا وقت زیادہ دور نہیں ہے۔

جیسا کہ ابھی ظاہر کیا گیا ہے، کانگرس کا مقابلہ دو جماعتوں سے ہے۔ ایک سوشلسٹ، دوسری کمیونسٹ اس لئے اپنے

آیندہ محاذ کو کامیاب بنانے کے لئے اس کوشش میں ہے کہ ان دو جماعتوں میں سے کمیونسٹ جماعت کو ختم کردے تاکہ اس کو صرف ایک ہی (سوشلسٹ) جماعت سے مقابلہ کرنا پڑے، چنانچہ مغربی بنگال میں اس جماعت کو غیر قانونی جماعت قرار دیکر اس پالیسی پر عملدرآمد بھی شروع ہوگیا ہے۔

سوشلسٹ اور کمیونسٹ جماعتیں مقصد کے لحاظ سے ایک ہی چیز ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ کمیونسٹ جماعت انقلاب پیدا کرکے جمہوریت کی بنیاد کو مضبوط کرنا چاہتی ہے اور سوشلسٹ جماعت نسبتاً زیادہ آئینی طریقے اختیار کرنے کی حامی ہے۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ اگر سوشلسٹ جماعت میں کوئی ردِ عمل ہوا تو کانگرس میں شامل ہونے کی جگہ اسکے کمیونسٹ ہو جانے کا زیادہ احتمال ہے اور سیاسی ذہنیتوں میں اس نوع کے انقلاب کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ سوشلسٹ جماعت کے بعض اکابر جو اس وقت تک کانگرس کے ساتھ مل کر کام کر رہے تھے اور جن میں مسٹر رفیع احمد قدوائی بھی شامل تھے کانگرس سے علٰحدہ ہوکر اپنا محاذ جداگانہ قایم کر رہے ہیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس تصادم میں وہ کس وقت کمیونسٹ نہ ہو جائیں گے۔

کانگرس حکومت سے ان کی شکایت اُصولی حیثیت رکھتی ہے اور وہ یہ کہ اس وقت کانگرس حکومت صرف ایک پارٹی کی حکومت ہے اور دنیا کی کوئی جمہوری حکومت صحیح معنے میں جمہوری حکومت نہیں ہوسکتی، جب تک اس میں کوئی حزب مخالف (بایاں بازو) نکتہ چینی کے لئے موجود نہ ہو۔

جب تک تقسیم ہند نہ ہوئی تھی اور مسلم لیگ کا وجود باقی تھا مرکز اور صوبوں میں حزبِ مخالف موجود تھا، لیکن اب کوئی نہیں ہے حالانکہ حکومت کے سامنے عوام کا طبقاتی نقطۂ نظر پیش کرنے اور حکومت کو اس کی غلطیوں پر متنبہ کرنے کے لئے مخالف بازو کا ہونا ضروری ہے اور اسی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر اب سوشلسٹ جماعت ایک دوسرے جھنڈے کو لیکر حکومت میں آنا چاہتی ہے۔

ظاہر ہے کہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے اس کو سب سے پہلے انتخابی مہم کو سر کرنا ہوگا، ہر چند کانگرس جماعت اپنی جگہ بہت مضبوط ہے، پھر بھی اس کے لئے آسان نہ ہوگا کہ اپنی "بلا مقابلہ انتخاب" کی روایت کو قایم رکھ سکے اور اگر اس دوران میں بدقسمتی سے عوام کو کچھ اور شکایتیں اس سے پیدا ہوگئیں تو عوام کا رجحان سوشلسٹ جماعت کی طرف ہو جائے گا اور اسکی کامیابی زیادہ غیر یقینی نہ رہے گی۔ یہ مقابلہ مرکز اور صوبوں کی حکومت کے لئے تو ابھی شروع نہیں ہوا، اس میں کچھ دن کی دیر ہے، لیکن ڈسٹرکٹ بورڈوں کے انتخاب میں یہ مقابلہ جلد ہونے والا ہے اور اگر اس وقت تک سوشلسٹ جماعت اپنے آپ کو زیادہ منظم کرسکی تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس امتحان میں ایک حد تک کامیاب ہو جائے، کیونکہ مسلم لیگ کے ختم ہونے کے بعد سوشلسٹ جماعت میں مسلمانوں کی شرکت کا بھی زیادہ امکان پیدا ہوگیا ہے اور چونکہ کمیونسٹ جماعت کو حکومت نے اپنا سخت مخالف بنا لیا ہے، اس لئے ہو سکتا ہے کہ وہ بھی انتقاماً سوشلسٹ جماعت کا ساتھ دے۔

اس میں شک نہیں کہ مہاتما گاندھی کے واقعۂ شہادت سے کانگرس کے ہاتھ بہت مضبوط ہو گئے ہیں، لیکن یہ محض جذباتی چیز ہے اور جوں جوں دن گزریں گے یہ تاثرات ضعیف ہوتے جائیں گے اور وہی تمام مخالف عناصر پھر اُبھر آئیں گے، جن کا

استیصال حکومت نے نہیں کیا اور نہ غالباً کر سکتی ہے۔

ہندوستان میں حکومت کے اقتصادی نظام کا تعلق کسانوں اور مزدوروں کی دو بڑی جماعتوں سے ہے جو زمینداروں اور سرمایہ داروں سے ٹکر لینے کے لئے بیتاب ہیں۔ پھر یہ تو ہو سکتا ہے کہ زمینداری کو ختم کر کے حکومت کسانوں کو خوش کر سکے، لیکن مزدوروں کو رام کرنے کا ذریعہ اس کے پاس کوئی نہیں کیونکہ وہ سرمایہ داروں کو ختم کرنے کے لئے آمادہ نہیں اور نہ شاید اس قدر جلد وہ اس میں کامیاب ہو سکتی ہے — اور — اس وقت سب سے بڑی گتھی حکومت کے سامنے یہی ہے کیونکہ جب تک مزدوروں کا طبقہ مطمئن نہ ہو، ملک کی صنعت ترقی نہیں کر سکتی اور اس طبقہ کے روز افزوں مطالبات اس قدر غیر محدود صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں کہ حکومت اور سرمایہ دار دونوں ان کو پورا کرنے سے قاصر ہیں اور اسی لئے حکومت نے کمیونسٹ جماعت کو غیر قانونی جماعت قرار دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا حکومت کا فیصلہ درست ہے، اور کیا وہ اس طرح مزدور طبقہ پر قابو پا سکے گی؟

میں سمجھتا ہوں کہ حکومت کا یہ فیصلہ صحیح نہیں ہے کیونکہ یورپ و امریکہ بھی اب تک کمیونسٹوں کو غیر قانونی جماعت قرار دینے کی ہمت نہیں کر سکے چہ جائیکہ حکومت ہند جو ہنوز عبوری دور سے گزر رہی ہے۔ اس لئے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہڑتالوں میں اس سے اور زیادہ شدت ہوگی، حکومت کو قوت سے کام لینا پڑے گا اور فساد و بدامنی کے ساتھ ساتھ طرفین کا اختلاف زیادہ سنگین ہوتا جائے گا۔

اس سے پہلے کانگریس نے ایک اجنبی قوم برطانیہ سے جنگ کی تھی اور کامیاب ہوئی لیکن اب اسے خود اپنی ہی قوم سے مقابلہ کرنا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔

تیسری عالمگیر جنگ کے آثار

جب دو ملکوں یا قوموں میں لڑائی ہوتی ہے، تو ان میں سے ہر ایک کا دعویٰ یہی ہوتا ہے کہ وہ حق پر ہے اور دنیا میں امن قایم کرنے کے لئے جنگ کرتا ہے، لیکن جب لڑائی ختم ہو جاتی ہے تو قیام امن کی تدبیریں پھر جنگ کا باعث ہو جاتی ہیں۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ امن و صلح کا تعلق دلوں سے ہے اور یہ کسی طرح صاف نہیں ہوتے۔ پچھلی لڑائی میں روس کی شرکت امریکہ و برطانیہ کے ساتھ محض اتفاقی بات تھی، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ دونوں کی راہیں بالکل علٰحدہ ہیں اور وہ کبھی ملکر ایک ہی راستہ پر نہیں چل سکتے، چنانچہ جنگ ختم ہوتے ہی اس کے آثار ظاہر ہونے لگے اور اب بدمزگی اس حد تک پہونچ گئی ہے کہ معلوم نہیں کس وقت روس و امریکہ میں جنگ چھڑ جائے۔

اس میں شک نہیں کہ جنگ کے بعد سے روس کے اثرات وسط یورپ میں نہایت تیزی سے بڑھتے جا رہے ہیں۔ پولینڈ زیکوسلوویکیا، ہنگری، رومانیا، یوگوسلیویا، بلغاریہ اور جرمنی کا چوتھائی حصہ تو کلیتاً سوویٹ حکومت کے زیر اثر آ چکے ہیں فن لینڈ سے بھی اس کا معاہدہ ہو چکا ہے اور اگر یونان و اطالیہ میں بھی کمیونسٹ جماعت برسر اقتدار آ گئی تو یہاں بھی روس کا اثر قایم ہو جائے گا۔ صرف انگلستان اور فرانس دو ملک باقی رہ جاتے ہیں جہاں ابھی تک سوویٹ اثرات کامیاب نہیں

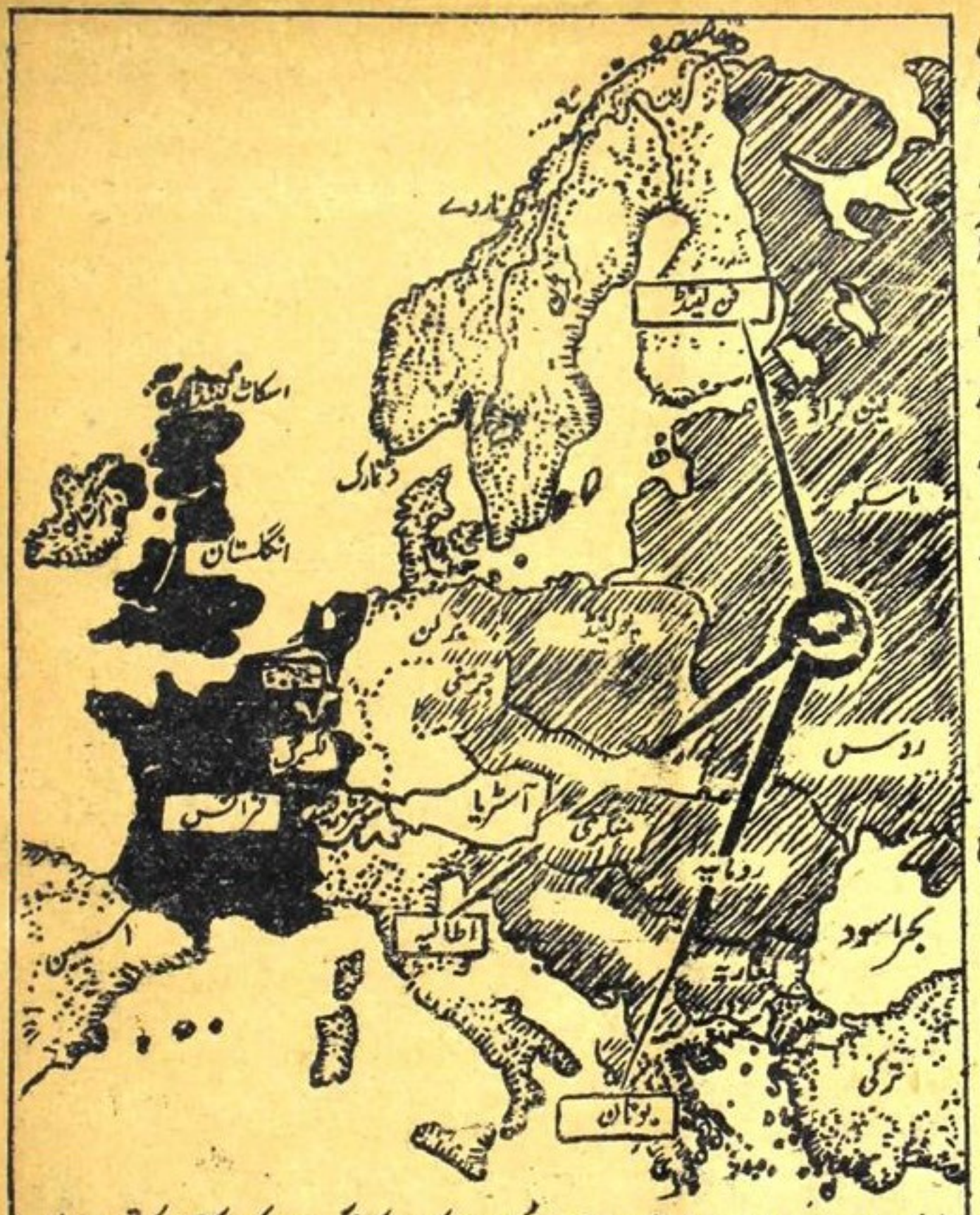

تاریک حصے وہ ہیں جہاں سوویٹ اثرات قایم ہو چکے ہیں اور کمپاس کی نوکیں ان ملکوں کو ظاہر کرتی ہیں جہاں سوویٹ اثرات قوی ہوتے جا رہے ہیں۔ باقی ممالک وہ ہیں جو امریکہ و برطانیہ کے زیر اثر ہیں، انھیں میں ترکی بھی شامل ہے جہاں کمیونسٹ جماعت کے خلاف مقدمے چلائے جا رہے ہیں۔

ہوئے، لیکن کمیونسٹ جماعتیں یہاں بھی قایم ہیں اور حکومتوں کو ان کی طرف سے سخت اندیشہ ہے — امریکہ چونکہ بہت بڑا سرمایہ دار ملک ہے اسلئے وہ روس کا سب سے بڑا دشمن ہے اور کمیونزم کے بڑھتے ہوئے اثرات کی طرف سے حد درجہ خایف ہے، کیونکہ خود امریکہ کے اندر کمیونسٹ جماعتوں کا جال خفیہ طور سے اتنا پھیلا ہوا ہے کہ ایک امریکن مبصر کے قول کے مطابق نہیں کہا جا سکتا کہ کس وقت امریکہ کے کارخانوں میں بم پھٹنے لگیں۔

امریکہ نے اس خطرہ کے پیدا ہونے کا بڑا سبب جنگ کے بعد یوروپ کی معاشی بدحالی کو قرار دیا اور اس نے خیال کیا کہ اگر یوروپ کے تباہ ملکوں کو مالی امداد پہونچائی جائے تو غالباً یہ خطرہ ختم ہو جائے، چنانچہ اس نے مارشل پلان کی رو سے اربوں ڈالر ان ملکوں میں تقسیم کئے، لیکن چونکہ یہ امداد بھی خلوص پر مبنی نہ تھی، بلکہ اس سے مقصود یہ تھا کہ جن ملکوں کو روپیہ دیا جا رہا ہے وہ اسی روپیہ سے امریکہ کی مصنوعات خریدیں تاکہ امریکہ میں جو ذخایر موجود ہیں وہ نکل جائیں اور صنعتی کساد بازاری پیدا نہ ہونے پائے اس لئے امریکہ کا مقصود پورا نہ ہوا۔ جو روپیہ اس نے دیا تھا وہ انھوں نے کھانے پینے میں صرف کر دیا اور وہی حالت پھر پیدا ہو گئی جو پہلے تھی۔ امریکہ نے یہ دیکھ کر دوبارہ امداد کا وعدہ کیا، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی کہدیا کہ اگر حکومتوں نے کمیونسٹ اثرات کو ختم نہ کیا تو وہ کوئی مدد نہ کرے گا، انگلستان تو خیر اس شرط کو اس طرح پورا کر رہا ہے کہ اس نے کمیونسٹ خیال کے آدمیوں کو ملازمت سے برطرف

کردینے کا اعلان کردیا، لیکن اطالیہ ابھی تک معلق حالت میں ہے، اگر وسط اپریل کے انتخاب میں وہاں کمیونسٹ حکومت قایم ہوگئی جسکا قوی امکان ہے تو وہ امریکہ کی امداد سے قطعاً محروم ہوجائے گا

بہرحال اس وقت کشاکش صرف روس و امریکہ کے درمیان ہے، ایک کے پاس عام پسند اُصولِ حکومت کی قوت ہے اور دوسرے کے پاس دولت اور اس طرح سرمایہ و عمل دونوں ایک دوسرے پر فتح پانے کے لئے جنگ سے قریب تر آتے جارہے ہیں۔ اس سے قبل امریکہ صرف کمیونزم کا نام لے لیکر اس مقابلہ کررہا تھا لیکن اب وہ صاف صاف روس کو اپنا حریف کہہ رہا ہے اور امریکہ میں عام فوجی بھرتی کی تجویز پیش کرکے گویا اسنے بالکل غیر مشتبہ الفاظ میں ظاہر کردیا ہے کہ وہ روس کے خلاف جنگ پر آمادہ ہے۔

۱۹۱۴ء کی جنگ میں امریکہ بالکل اخیر میں شریک ہوا اور دوسری جنگ میں بھی کافی عرصہ کے بعد اور اس کا خیال ہے کہ اس تعویق و تاخیر سے اسکے مقاصد کو کافی نقصان پہونچا، اس لئے اب وہ یہ غلطی نہ کریگا اور سب سے پہلے میدان میں آئے گا لیکن کہاں ؟ یونان میں، اطالیہ میں یا ایران میں ؟ اس کا فیصلہ ابھی تک نہیں ہوسکا۔

کشمیر کی گتھی ہندوستان و پاکستان کے باہمی تعلقات میں اس وقت تک کوئی خوشگوار تبدیلی پیدا نہیں ہوسکتی، جب تلک کشمیر کا مسئلہ طے نہ ہو اور اس کے طے ہونے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس پر تو دونوں حکومتوں کا اتفاق ہے کہ الحاق کشمیر کا مسئلہ اہل کشمیر کی رائے پر چھوڑ دیا جائے، لیکن رائے شماری کی شرطیں دونوں طرف سے ایسی پیش کیجارہی ہیں جن کا پورا ہونا بہت مشکل ہے۔ حفاظتی کونسل میں اسوقت تک فریقین کے درمیان جو سوال و جواب ہوا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان رائے شماری کی صحت اسی وقت تسلیم کرسکتا ہے، جب ہندوستانی فوجیں وہاں سے بالکل ہٹ جائیں، شیخ عبداللہ کی حکومت ختم کردیجائے، اور جتنے لوگ وہاں سے ہجرت کرگئے ہیں وہ واپس آجائیں۔ ہندوستان کا کہنا یہ ہے کہ سب سے پہلی شرط فوجیں ہٹانے کی یہ ہے کہ سرحدی حملہ آوروں کی تاخت کو پاکستان رُوک دے۔ پاکستان یہ جواب دیتا ہے کہ سرحدی حملہ آوروں کی تاخت کو روکنا اسکے امکان میں نہیں کیونکہ جن جن علاقوں اور راستوں سے وہ کشمیر جاتے ہیں وہ حدود پاکستان سے باہر ہیں، لیکن یہ ضرور ہوسکتا ہے کہ ہندوستانی فوجیں ہٹنے کے بعد وہ سرحدی قبایل سے بھی تاخت ختم کردینے کی درخواست کریں اور اگر اس پر بھی وہ نہ مانیں تو ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کی فوجیں ملکر انکا مقابلہ کریں۔ حفاظتی کونسل اسکے لئے طیار ہے کہ وہ رائے شماری اپنی نگرانی میں کرے اور وہ اس کی بھی موافق ہے کہ ہندوستانی فوجیں کچھ کم کردیجائیں اور کسی قدر پیچھے ہٹ جائیں، لیکن شیخ عبداللہ کی حکومت کو ختم کردینے پر وہ اصرار نہیں کرسکتی، کیونکہ رائے شماری کے زمانہ میں بھی کسی نہ کسی حکومت کا وہاں پایا جانا ضروری ہے اور اس میں شک نہیں کہ حفاظتی کونسل کے لئے اس کا تصفیہ بہت مشکل ہوگیا ہے، اور جب تک فریقین خود ہی کوئی راہ نہ نکالیں اس گتھی کا سلجھنا مشکل ہے۔ ہماری رائے میں فریقین کو اپنے مطالبات کچھ اور نرم کرنا چاہئے اور اسکی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ ہندوستانی فوجیں سرزمین کشمیر خالی کرکے اپنی سرحد تک آجائیں اور شیخ عبداللہ کی حکومت اس وقت تک بالکل نیوٹرل رہنے کا اعلان کردے جب تک رائے شماری نہ ہوجائے۔ اگر اس اعلان کے بعد سرحدی قبایل اپنی تاخت ختم

کردیں تو حفاظتی کونسل اپنی نگرانی میں رائے شماری کرے، اور اگر سرحدی حملے ختم نہ ہوں تو پھر ہندوستان، پاکستان اور کشمیر تینوں حکومتیں ملکر پہلے اس خطرہ کا استیصال کریں اور پھر امن قایم ہوجانے کے بعد ہندوستانی فوجیں واپس آجائیں اور حفاظتی کونسل ہی کی نگرانی میں رائے شماری ہو۔

قضیۂ فلسطین اب سے قبل یہ بات تقریباً طے پاگئی تھی کہ آیندہ مئی میں برطانیہ کا انتداب ختم ہونے کے بعد فلسطین کے دو ٹکڑے کرکے عربوں اور یہودیوں کی علٰحدہ علٰحدہ حکومتیں قایم کردیجائیں گی اور اس مقصد کے تحت فلسطین کمیشن کے مقدمۃ الجیش نے اپنا کام بھی شروع کردیا تھا، لیکن اب امریکہ نے اپنے تقسیم فلسطین کے فیصلہ کو واپس لیکر لوگوں کو حیرت میں ڈالدیا ہے کہ ٹرومین صدر امریکہ کی پالیسی میں دفعتاً یہ انقلاب کیوں پیدا ہوا۔ امریکہ میں یہود آبادی بہت مضبوط ہے اور امریکی صنعت کی ترقی میں وہ نمایاں حصہ لے رہی ہے، اس لئے ٹرومین نے اس جماعت کو خوش کرنے کے لئے یا اُن کی امداد پر بھروسہ کرکے عرب اقوام کے خطرہ کو نظر انداز کردیا تھا اور تقسیم پر رضامندی ظاہر کردی تھی لیکن جب عرب لیگ کے جوش کو دیکھ کر امریکہ کو یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں اس جھگڑے میں اسے سعودی عرب کے پٹرول سے ہاتھ نہ دھونا پڑے تو وہ اپنے تقسیم فلسطین کے فیصلہ سے ہٹ گیا۔ اس سلسلہ میں ایک اندیشہ امریکہ کو اور پیدا ہوا وہ یہ کہ تقسیم فلسطین کا روس بھی حامی تھا اور فیصلۂ تقسیم کے نفاذ کے لئے وہ بھی اپنی فوجیں یہاں بھیجتا اور اس طرح فلسطین میں پاؤں جمانے کی دیرینہ خواہش روس کی پوری ہوجاتی۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ امریکہ کا تازہ فیصلہ بھی اسے اس اندیشہ کی طرف سے مطمئن نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اگر عربوں اور یہودیوں کے درمیان کوئی سمجھوتا نہ ہوا جس کا یقین ہے، تو فلسطین میں بین الاقوامی تولیت قایم کرنے کی کوشش کی جائے گی اور عرب و یہود کا جھگڑا ختم کرنے اور امن قایم کرنے کے لئے بین الاقوامی فوج سے کام لیا جائے گا جس میں روسی فوجوں کا شمول بھی ضرور ہوگا، اور امریکہ اسی چیز سے ڈرتا ہے۔ بہرحال فلسطین کی گتھی میں بھی درپردہ وہی روس و امریکہ کی باہمی مخالفت حارج ہورہی ہے اور ہوسکتا ہے کہ آیندہ جنگ کا شعلہ سرزمین یروشلم ہی سے بلند ہو۔

گو انگلستان اپنی جگہ طے کرچکا ہے کہ وہ ۱۵ مئی کو فلسطین خالی کردے گا اور اسے یہاں کے جھگڑوں سے کوئی تعلق نہ ہوگا، لیکن اگر اس مسئلہ نے بین الاقوامی نزاع کی صورت اختیار کی تو انگلستان بھی اس آگ کی لپٹ سے محفوظ نہ رہیگا اس لئے محفوظ صورت صرف یہی ہے کہ فلسطین کے نزاع کو صرف مقامی حیثیت دیجائے اور بین الاقوامی تولیت کا خیال ترک کرکے اس جھگڑے کو بین الاقوامی نزاع نہ بنایا جائے۔ اگر یہود و عرب لڑتے ہیں تو لڑیں، ان میں سے کسی کو کسی قسم کی امداد نہ دیجائے۔ لیکن یہ صبر و ضبط نہ امریکہ کے امکان میں ہے نہ روس کے بس میں اور مئی ۴۸ء کے بعد یہاں جو کچھ ہوتا نظر آتا ہے، اس کا صحیح تصور بھی ہم فی الحال نہیں کرسکتے۔

جوبلی نمبر

اگر آپ کو نہیں ملا ہے یا کسی وجہ سے آپ نے نہیں لیا، تو اب بھی، چند دن کے بعد یہ بے بہا تاریخی و ادبی ذخیرہ آپ کو کسی قیمت میں نہ ملے گا۔
قیمت خریداران نگار سے ڈیڑھ روپیہ (۱۵۰) - غیر خریداران سے تین روپیہ (۳۰۰)
مینجر نگار

ادب میں نفسیات

ذہنِ لاشعور کی دریافت اس صدی کا وہ حیرت انگیز کارنامہ ہے جس نے فنونِ لطیفہ میں بہت سی نئی تحریکوں کی بنیاد رکھی ہے اور اظہار کے طریقوں میں نئے اسلوب سے رنگ آمیزی کی ہے۔ بُت تراشی، مصوری اور شاعری کے بہت سے دھندلے خطوط اور غیر واضح خدوخال جدید نفسیات کی روشنی میں زیادہ واضح اور زیادہ روشن نظر آنے لگے ہیں۔ مغربی آرٹ (Art and Sculpture) میں تاثریت (Impressionism) اور مابعد تاثریت (Post-Impressionism) کی تحریکات اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہیں کہ ان پر جدید نفسیات کا گہرا اثر ہے۔ اسی طرح رمزیت (Symbolism) کی تحریک بھی نفسیات کی جدید دریافتوں سے غیر متعلق نہیں ہے کیونکہ اس کا بنیادی خیال بھی یہی ہے کہ ادب کا مقصدِ اولین نفسی صورتوں (Psychological Meanings) کی کامیاب تخلیق ہے۔ اس دوران میں شعور کی رو (Stream of Consciousness) کی جستجو فنکاروں کا محبوب مشغلہ رہا ہے اور یہ خیال زور پکڑتا گیا ہے کہ انسانی ذہن کی عکاسی ٹھیک اسی صورت میں کرنا چاہئے، جس صورت اور جس رفتار سے وہ خیال کی کرنیں پڑنے سے جگمگاتا گیا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ادیب جو راہ اختیار کرتے ہیں وہ آزاد تلازمِ خیال (Free association of Ideas) کی منزل تک رہ نمائی کرتی ہے اور اس راہ میں بھی قدم قدم پر جدید نفسیات کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ اس مدرسۂ فکر کے ادیب یہ بھی سمجھتے ہیں کہ خیال کی تجریدی حیثیت کوئی نہیں اور کوئی تصور بھی ذہن میں زیادہ دیر تک تنہا نہیں رہتا بلکہ مماثل تصورات اور ملتے جلتے جذبات کو بیدار کر دیتا ہے۔ اسی لئے ان کی تخلیقات میں خیال عموماً اُلجھا ہوا ملتا ہے اور جذبات کی سادگی، پیچیدگی (Complex feelings) میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

اس نئے رجحان نے ادب اور شاعری میں کئی گل کھلائے۔ ایک جانب تو افسانوں اور ناولوں میں ذہنی کیفیات کے تفصیلی اظہار کا اندازہ آگیا اور دوسری جانب بنیادی مسایل پر خارجی غور و فکر کی اہمیت کم ہو گئی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ شاعری سے فکر کے عناصر (Thought-Element) زایل ہو گئے۔ صرف اتنا ہوا کہ اب اس سوچ بچار نے وہ راہ اختیار کر لی جہاں احساسات سب سے بڑی حقیقت مانے جاتے ہیں۔ گویا شاعروں نے دماغ کے بجائے اعصاب سے سوچنا شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ ایک اور نتیجہ یہ ہوا کہ شاعرانہ محسوسات میں کیفیت کی اہمیت بڑھ گئی۔ اول تو شاعر

جذبات کے نفسی اثرات کا تفصیلی اظہار کرنے لگا اور یہ بتانا تقریباً غیر ضروری ہو گیا کہ کسی مخصوص کیفیت کی وجہ کیا ہے۔ دوسرے اپنے احساسات کے اظہار کے لئے جو الفاظ اس نے منتخب کئے وہ بھی ایسے تھے کہ خیالات کی پرچھائیوں اور سایوں کو واضح کر دیتے تھے اگرچہ جذبے کی مرکزیت باقی نہیں رہتی تھی۔ اس طرزِ فکر کی بڑی اچھی مثال سوئن برن (Swinburne) کی شاعری ہے جس کے یہاں خیال مختلف سلسلوں میں پھیلا ہوا ہے اور دھندلا (Vague) ہے کیونکہ شاعر نے الفاظ کے باہمی ربط کی مدد سے مفہوم واضح کرنے سے زیادہ فضا پیدا کرنیکا کام لیا ہے۔

یوروپ کے فکری و ادبی حلقوں میں فرائیڈ (Freud) ، رسل (Russel) اور ایلس (Ellis) کی تحریریں عرصہ تک موضوعِ بحث رہی ہیں اور اگرچہ روسی ادیب یہی کہتے رہے کہ یہ نظریئے بورژوا (Bourgeoisie) حلقوں کے ذہنی فرار کی علامت ہیں لیکن ان نظریات کا اثر بڑھتا گیا اور خصوصاً فرائیڈ کے نظامِ نفسی (System of Psychology) نے وہ مقبولیت حاصل کر لی کہ کم از کم اسلوب کی حد تک اسکے غیر محسوس اثر سے روسی ادیب بھی نہیں بچ سکے۔ مثال کے طور پر ٹرجینف (I. Turgenev) کا A. Quiet Backwater اور دستووسکی (Dostoevsky) کا Bobok پیش کئے جا سکتے ہیں، جن میں یہ اثر بہت نمایاں ہے۔

سوویٹ یونین سے باہر کے مارکسی حلقوں میں اس اثر کی وجہ سے اور بھی زیادہ انتشار پھیلا۔ اول تو اس لئے کہ ادیبوں کی توجہ معاشی مسائل سے ہٹ کر جنسی اُلجھنوں اور ذہنی پیچیدگیوں کی جانب مائل ہو رہی تھی۔ ڈی۔ ایچ لارنس (D. H. Lawrence) نے تو شروع ہی سے محبت کے جنسی بلکہ جسمانی پہلو کو اپنا موضوعِ بیان قرار دیا تھا۔ اسی عرصے میں کئی ناول ایسے بھی لکھے گئے جن میں جنسی بے راہ روی (Sex Perversion) ہی خاص موضوع تھا۔ ان ناولوں میں طوائف کی زندگی کے متعلق W. X. George کا Alley Roses ، اور غیر معمولی جنسی رجحان کی بابت Radclyffe Hall اور Elizabeth Bowen کا "The Well of Loneliness" اور "The Hotel" قابلِ تذکرہ ہیں۔

دوسری شکایت مارکسی ادیبوں کو یہ تھی کہ اس اثر کی وجہ سے سماج کے بجائے فرد نے زیادہ اہمیت اختیار کر لی تھی اور فرد کی حیثیت سماجی تعلقات سے الگ ایک منفرد اکائی کی حیثیت سے بھی تسلیم کی جانے لگی تھی۔ تیسری اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ یہ نیا نظامِ نفس مارکسی فلسفے کے دعویٰ ہمہ گیریت کے لئے چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا

چنانچہ انگلستان کے ممتاز مارکسی ادیب جان اسٹریچی (John Strachey) نے اس امر پر زور دیا کہ مارکسی فلسفے سے ایک مکمل نظامِ نفسی بھی اخذ کیا جا سکتا ہے۔ بدحواسی کی انتہا یہ تھی کہ کچھ لوگوں نے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ذرا سی ردوبدل کے بعد مارکس اور فرائیڈ کے نظریوں میں کوئی تضاد نہیں رہتا۔ جس طرح مارکس نے ہیگل (Hegel) کے خیال اور مادے

کے تصور کو اُلٹ کر ٹانگوں کے بل کھڑا کر دیا تھا اسی طرح ان لوگوں نے دعویٰ کیا کہ تھوڑی سی ترمیم کے بعد نہ صرف فرائڈی نظریات معاشی طور پر قابلِ قبول بن سکتے ہیں بلکہ انھیں انقلابی حربے کی صورت میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں شک نہیں کہ فرائڈ نے بہت سے فرسودہ توہمات کی بوسیدہ عمارتوں کو ڈھا دیا ہے۔ اس طور پر سوچنے والوں میں اوسبارن (B. Osborne) نے بڑے مبالغہ سے کام لیا ہے۔ فرائڈ کا خیال تھا کہ بہت سی ذہنی پیچیدگیوں کی وجہ بیٹے کا ماں سے جنسی عشق (Oedipus Complex) ہے اور اس صورت میں باپ سے تعلقات رقابت اور دشمنی کی حد تک پہونچ جاتے ہیں۔ اوسبارن کہتا ہے کہ دراصل باپ علامت ہے موجودہ ریاست کی اور ہر شخص کی فطری خواہش ہے کہ اشتمالی ریاست قایم کرے لیکن جب بیرونی حالات ساتھ نہیں دیتے تو فرد دماغی اُلجھنوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس خواہش کی غیر آسودگی ہی حقیقت میں تمام ذہنی پیچیدگیوں کی وجہ ہے۔

ادبی افکارات اور مصوری سے قطع نظر، دوسرے فنون میں بھی نفسیاتی اثر کی کارفرمائیاں کم اہم نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ فنِ تعمیر (Architecture) میں بھی یہ رجحان رنگ لائے بغیر نہیں رہا ہے ——————

—————— بُت تراشی میں تو یہ بات سمجھ میں آتی تھی کہ اشیاء کی ٹھوس ماہیت سے قطع نظر کیفیت (یا زیادہ صحیح لفظوں میں اس مخصوص لمحے کی کیفیت) کو بھی پیش کیا جائے، لیکن اب گرجا اور دوسری عمارتوں کی تعمیر میں بھی کل کے مجموعی حسن اور تناسب کی خوبیوں سے زیادہ روشنی اور سائے (Light and Shade) کے اثر پر توجہ مبذول ہو گئی۔

مغرب کی ان ذہنی تحریکات سے اُردو ادب بھی متاثر ہوا ہے اور خیال کی لہریں برقی سرعت سے یہ مسافتِ بعید طے کر کے یہاں پہونچ گئی ہیں۔ ہماری شاعری، افسانوں اور ناولوں پر جو اثر جدید نفسیات نے ڈالا ہے وہ کافی اہم ہے۔ نئی شاعری کی آزاد و معریٰ نظمیں کبھی رواج نہیں پا سکتی تھیں اگر ذہنِ لاشعور کی دریافت لوگوں کو ذہنی بے ربطیوں میں ربط پیدا کرنے کی کاوش کے لئے ہموار نہ کر چکی ہوتی۔ اسی طرح افسانوں اور ناولوں میں پلاٹ کی بے نظمی اور حادثات و واقعات کی غیر موجودگی کی تلافی بڑی حد تک نفسیاتی پس منظر کی وجہ سے ہو جاتی ہے۔ اس اثر کو کچھ ادیب محض اسلوب کی حد تک اہمیت دیتے ہیں مگر کہیں کہیں یہ اپنا مقصود آپ بھی ہے۔ (مثال کے طور پر ممتاز مفتی کے افسانے پیش کئے جا سکتے ہیں۔)

اس سے انکار ممکن نہیں ہے کہ اس اثر کی وجہ سے ہمارے ادب میں بڑی گہرائی و معنویت اور عجیب ٹھہراؤ اور تنوع پیدا ہو گیا ہے۔ ذہن کے آزاد و فطری تسلسل اور شعوری و لاشعوری کش مکش کے بیان سے فنکار بہت فایدہ اُٹھا سکتا ہے۔ نفسیاتی پس منظر کی وجہ سے نہ صرف انسانی فطرت اور اس کی خوبیاں و کمزوریاں زیادہ اُجاگر اور زیادہ روشن ہو جاتی ہیں بلکہ نفسیاتی اشارات کی مدد سے کیفیاتی اثر بھی پیدا کیا جا سکتا ہے اور اب یہ پوچھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ

ہے مزا کون سی کہانی میں　　آپ بیتی کہوں کہ جگ بیتی

نفسیاتی اشاروں کی مدد سے آپ بیتی کو جگ بیتی اور جگ بیتی کو آپ بیتی کے روپ میں پیش کیا جا سکتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے ادب اور آرٹ میں آفاقی انداز جھلکنے لگتے ہیں۔

جدید نفسیات نے الفاظ کے معنوں میں بڑی وسعت پیدا کر دی ہے اور یہ کچھ علمِ نفسیات پر ہی موقوف نہیں۔ تمام علوم ارتقاء کے دوران میں اپنے نقوش الفاظ پر ثبت کرتے گئے ہیں۔ زندگی جیسے ہی آگے بڑھتی ہے الفاظ کے مفہوم میں زیادہ وسعت اور زیادہ لچک پیدا ہو جاتی ہے۔ جس طرح کرنوں کا زاویہ بدلتے ہی ہیرے کے نئے و مختلف پہلو جگمگا اُٹھتے ہیں اسی طرح نسلوں کا بدلتا ہوا زاویۂ نگاہ بھی الفاظ پر اثر انداز ہوتا ہے اور نئے نئے گوشے ہماری نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔ اس لئے ادیب صحیح لفظوں کی تلاش میں ہمیشہ سرگرداں رہے ہیں۔ ان کی ساری جستجو اس امر پر مرکوز رہی ہے کہ اپنے تاثرات کے اظہار کے لئے موزوں ترین الفاظ ڈھونڈھ سکیں۔ فلوبرٹ (Flaubert) اسی لئے اپنے عزیز شاگرد موپاساں (Maupassant) کو لکھتا ہے کہ جو کچھ بھی ہم کہنا چاہیں اس کے اظہار کے لئے صرف ایک لفظ، ایک فعل اور ایک اسم صفت ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ جب تک ہم اس خاص لفظ اس خاص فعل اور اس خاص اسم صفت کو نہ جان لیں مطمئن نہ ہوں اور اپنی تلاش برابر جاری رکھیں — اگر غور سے دیکھا جائے تو لفظوں کی دو حیثیتیں ہیں ایک غیر مربوط جس کی خود بھی دو شاخیں ہیں۔ یعنی صوتی کیفیت اور معنوی خصوصیت۔ معنوی خصوصیت کی اہمیت اس وجہ سے کہ کہنے والے کا مفہوم بغیر کسی معنویت کے واضح نہیں ہوتا ——— لیکن دراصل یہ معنویت بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ایک خاص سمت کی جانب اشارہ کر دیتی ہے۔ اور اشارے کے اس وار کو زیادہ کاری اور زیادہ بھرپور بنانے کے لئے صوتی خصوصیتوں کا سہارا لیا جا سکتا ہے۔ لفظوں کی دوسری حیثیت وہ ہے جو ان کے میل جول اور ترتیب باہمی سے پیدا ہوتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ کوئی لفظ الگ سے کانوں کو بھدا اور ناخوشگوار معلوم ہوتا ہو لیکن ایک خاص قسم کی فضا میں اور کچھ لفظوں کے درمیان وہی لفظ سارے مفہوم کی جان بن جائے۔ پھر ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ لفظوں میں انفرادی طور پر کوئی خصوصیت نہ ہو لیکن جب انھیں ایک خاص انداز سے ترتیب دیں تو آہنگِ اثر میں ڈھل جائیں۔

اس طرح الفاظ گویا دو طرح کا اثر پیدا کر سکتے ہیں۔ ایک تو اپنے مروجہ مفہوم کی وجہ سے اور دوسرے صوتی حیثیت اور دوسری خصوصیتوں کی بناء پر۔ ادب کی تاریخ میں ان دونوں اثرات کی اہمیت یکساں نہیں رہی ہے۔ آج سے پہلے مفہوم کی اہمیت کو تسلیم کیا جاتا تھا اور تاثر کی حیثیت ضمنی تھی۔ لیکن آج اس کے بالکل برعکس ہے۔ اب فن کار کی تخلیقی قوتیں بیشتر کسی خاص تاثر کے بیدار کرنے میں صرف ہوتی ہیں اور اس دوران میں انگریزی بلکہ اُردو میں بھی بہت سی نظمیں ایسی لکھی گئی ہیں کہ جن کے پڑھنے سے ایک خاص فضا اور ایک خاص لے کا احساس تو ہوتا ہے لیکن جن کا مفہوم نہ ہونے کے برابر ہے۔ استثنائی صورتوں کے علاوہ اس طرح کی نظموں کی غیر مقبولیت اس بات کی علامت ہے کہ ہم مفہوم سے بالکل علٰحدہ ہو کر کسی تاثر سے لطف حاصل نہیں کر سکتے اور اچھے و صالح ادب کے لئے مفہوم و تاثر کی کم و بیش ہم آہنگی اور توازن ضروری ہے۔

ابھی تک ادیبوں کے لئے الفاظ دو دھاری تلوار کی حیثیت رکھتے تھے کیونکہ ان کے مفہوم کا پورے طور پر تعین کبھی نہیں ہوا جن لفظوں کو روایتی استعمال نے مخصوص معنی دے رکھے ہیں وہ بھی ان ہی معنوں پر بس نہیں کرتے۔ مثلاً شمع کا لفظ زبان سے نکالتے ہی وہ تصورات جو اس کے ساتھ وابستہ ہو گئے ہیں، ذہن میں آجاتے ہیں، لیکن چند ایسے خیالات بھی جاگ اُٹھتے ہیں جنھیں بظاہر لفظ کے معنی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اسی لئے اب تک اُردو شاعروں نے خیال کو منطق کی زنجیروں سے باندھ رکھا تھا تاکہ بہکنے کے لئے زیادہ گنجایش نہ رہے۔ اسی وجہ سے اُردو شاعری کا انداز بیان ابھی تک کچھ دعویٰ اور دلیل کی منطقی قسم کی تکنیک پر مبنی تھا مثلاً

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا — باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا (غالب)

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تمام اُردو شاعری میں یہی انداز بیان اختیار کیا گیا تھا۔ ہمارے ادبی سرمائے میں بہت سے اچھے اشعار ایسے مل جاتے ہیں کہ جن کا مطلب ان کے ظاہری مفہوم سے ماوراء ہے۔ ہمارے یہاں الفاظ کی صوتی کیفیت سے بھی فایدہ اُٹھایا گیا ہے اور آواز کے اُتار چڑھاؤ سے بھی ایک خاص قسم کی مطابقت پیدا کی گئی ہے۔ مثلاً ان مصرعوں میں:

کہ دوں دوں خوشی کی خبر کیوں نہ دوں (میر حسن)
رنگ ہا بو ہا ہوا ہا آب ہا (اقبال)

لیکن اب الفاظ کی موسیقی، ان کی صوتی کیفیت اور ان کے مفہوم کی ماورائیت سے شعوری طور پر فایدہ اُٹھایا جا رہا ہے ایک شاعر کے نازک احساسات یا وہ تجربات جو عقلی اظہارِ بیان کا بوجھ نہیں سنبھال سکتے اس تکنیک کی مدد سے کم سے کم کسی حسین تاثر کی تخلیق ضرور کر سکتے ہیں۔ اس طرح شاعر کے ذہن میں جو تخلیقی تصور جاگ اُٹھتا ہے نہ صرف ہم اس کی ارتقائی مدارج سے واقف ہو سکتے ہیں بلکہ اس کے احساس کی شدت کا پتہ بھی چلا سکتے ہیں، ممکن ہے کہ ہم فیض کی نظم "تنہائی" کا عقلی مفہوم سمجھنے سے قاصر رہیں مگر یہ ممکن نہیں کہ اس زوردار اور دل کش نظم سے متاثر نہ ہوں جو ہمارے پنہاں جذبات سے کھیلتی اور داخلی محسوسات پر براہِ راست اثر انداز ہوتی ہے۔

زندگی تمام تر حادثات و واقعات سے بھرپور ہے اور ہر حادثے یا ہر واقعے میں نفسیاتی تجربہ بننے کی صلاحیت ہے لیکن ادیب یا شاعر کا مقصد نفسیاتی حقایق کی موشگافی سے زیادہ حسن کی تخلیق ہے۔ اس کے علاوہ کسی جذبے کی نفس حقیقت اسی جذبے کی شاعرانہ، فلسفیانہ یا ادیبانہ تشریح سے مختلف ہو سکتی ہے۔ اور نفسیات سے یہ اختلاف لازمی طور پر غلط ہونے کی دلیل نہیں کیونکہ کسی شے کے سچ ہونے اور سچ معلوم ہونے میں بھی بڑا فرق ہے۔ پھر نفسیات کے متعدد دبستانوں میں جس قدر اختلاف پایا جاتا ہے اس کے دیکھتے ہوئے کوئی قطعی فیصلہ کیا بھی نہیں جا سکتا۔ اس کے علاوہ ادیب کا مقصدِ اولیں اثر آفرینی ہے اس لحاظ سے جذباتی تحلیل واسطہ بن سکتی ہے، منزل نہیں۔

نفسیات کے ان اثرات نے جہاں انسانی ذہن و فکر کو اپنی جولانگاہوں کے لئے نئے میدان عطا کئے ہیں وہاں کچھ

حیثیتوں سے ادب کا دائرہ کچھ محدود بھی ہوگیا ہے۔ مثال کے طور پر محبت کے جذبے کو لے لیجئے۔ اب تک اسے زندگی کی اٹل حقیقتوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ لیکن آج کا ادیب و شاعر یہی فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اسے کسی فردِ خاص کی جانب جو کشش محسوس ہو رہی ہے وہ محض جسم کی آواز ہے یا اس میں کچھ ذہنی موانست کی جھلک بھی ملتی ہے۔ یہی نہیں کبھی کبھی وہ یہ بھی سوچنے لگتا ہے کہ یہ کشش روزمرہ کی تلخ زندگی سے فرار کی ایک صورت تو نہیں ہے۔ محبت کی وہ یقینی (Possession) وہ تند و تیز اور وہ چھا جانے والی کیفیت ختم ہوگئی ہے جو اسے حیات و کائنات کی عظیم تر حقیقتوں سے وابستہ کئے ہوئے تھی۔ اب یہ جذبہ زیادہ سے زیادہ وہم و گمان کی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈی۔ ایچ لارنس کے کرداروں میں تو شروع سے آخر تک یہ پتہ چلانا مشکل ہوتا ہے کہ وہ ذہن کی گہرائیوں میں ایک دوسرے سے نفرت کر رہے ہیں یا محبت۔ (یہ تاریکی "Woman in Love" میں تو اتنی زیادہ شدید ہوگئی ہے کہ موت کی کرنیں بھی اُجالا نہیں کر سکیں)۔ گھڑی کی رک رک کی سی باقاعدگی کے ساتھ ایک لمحے میں کسی انجانی رو کے زیر اثر وہ ایک دوسرے کی جانب کھینچتے ہیں اور دوسرے لمحے نفرت کا شدید جذبہ انھیں ایک دوسرے سے علٰحدہ ہو جانے پر مجبور کر دیتا ہے۔

ادب میں جب تک کسی ترتیب و تعمیر کی جھلک نہیں ملتی عظمت کے آثار بھی مفقود ہوتے ہیں۔ نفسیات کے اثر سے گہرائیاں اور باریکیاں ادب کے خمیر میں پیوست ہوگئی ہیں لیکن اپنی منطقی حد کو پہونچ کر یہ اہمال میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ ادب کا کارنامہ صرف اتنا ہی نہیں کہ یہ ذہن کے تاریک گوشوں کو روشن کر دیتا ہے بلکہ اس روشنی میں ہم وہ منبع نور بھی دیکھ سکتے ہیں جو کائنات کے بھیدوں کو جگمگا دیتا ہے۔ آج کے ادب میں سب کچھ ہے لیکن وہ عظمت نہیں جو انسان کو بلندیوں کی طرف مائل کرے، وہ الم نہیں جو روح کو بالیدگی عطا کر سکے اور وہ نشاط نہیں جو کل حیات پر محیط ہو سکے۔

جدید نفسیات کے اثر سے ہمارے ادیب ایک اور بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جو زبان پر آئے کہہ دینے اور جو کچھ جی میں آئے لکھ دینے کا نام ہی ادب ہے۔ حالانکہ آزاد تسلسل کی جس تکنیک کو وہ کام میں لاتے ہیں وہ اتنی زیادہ سہل نہیں ہے۔ اس سہل میں جو دشواری ہے اس کا انھیں اندازہ نہیں۔ ادب میں منطقی ربط پیدا کرنا آسان ہے لیکن نفسی ہم آہنگی قایم کرنا بے حد دشوار ہے۔ ایک بے محل لفظ اور ایک ناموزوں آواز سارا طلسمِ کیفیت غارت کر سکتی ہے۔ اسکے علاوہ آزاد تسلسل کی ظاہری بے ربطیوں میں اگر کوئی باطنی ربط نہیں ہے اور اگر وہ نفسی کیفیتوں کو ایک ہی زنجیر میں جوڑنے والی مختلف کڑیاں نہیں ہیں تو ان کی اہمیت مجذوب کی بڑ سے زیادہ نہیں رہتی۔ فراق جب کہتے ہیں:

زمانہ کتنا لڑائی کو رہ گیا ہوگا
میرے خیال سے اب ایک بج رہا ہوگا

تو بجائے متاثر ہونے کے بے اختیار ہنسنے کو جی چاہتا ہے کیونکہ کچھ ایسا احساس ہوتا ہے کہ خیال کی یہ موج جذبات کے فطری تلاطم کا نتیجہ نہیں ہے اور محض آزاد تکنیک کی نمایش کے لئے خیال کے دو سلسلوں کو جوڑ دیا گیا ہے۔

جدید نفسیات نے ادب پر چھانے کی کوشش ضرور کی ہے لیکن ادیب، و ماہرِ نفسیات کے منصب الگ الگ ہیں۔ انسانی خیالات و افکار کی تشکیل بہت کچھ مادی رابطوں اور گردوپیش کے حالات سے ہوتی ہے لیکن ماہرِ نفسیات ان تعلقات کو بھول کر کسی فرد پر تجریدی حیثیت سے نظریں ڈالتا ہے۔ لیکن ایک فنکار کا کام اس سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ اسے صرف یہی نہیں دیکھنا کہ ناک میں مکھی گھس جانے سے کیا تاثرات پیدا ہو سکتے ہیں یا کسی خاص ذہنی کیفیت کے تحت "اُلّو کا پٹھا" کہنے کی خواہش کس طرح شدید ہو سکتی ہے۔ بلکہ اسے ان واسطوں سے زندگی کی رنگارنگیوں تک رسائی حاصل کرنا ہے۔ پھر اس کا مخصوص اندازِ نظر بھی سچ میں جھوٹ اور حقیقت میں تصوریت کی جھلک دیکھ سکتا ہے۔

کوئی ادیب بھی زندگی کے تمام واقعات و حادثات پیش نہیں کر سکتا اس لئے ان واقعات کے انتخاب میں سلیقے کی بھی ضرورت ہے۔ اسے یہ دیکھنا ہے کہ حسن کار کی جمالی لذت، عام اخلاقی وجدانات عوام کی مادی ضروریات اور کسی فردِ خاص کے انفرادی تجربات میں سے کون اس کے دل سے زیادہ قریب ہے اور کسے وہ پورے خلوص و سچائی کے ساتھ پیش کر سکتا ہے۔

حنیف فوق

حضرت نیاز فتحپوری کی ایک بے مثل تصنیف

"من و یزداں"

جو اپنی انشاء عالیہ اور پرزور خطیبانہ تحریر کے لحاظ سے معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتی ہے ——— اور اخلاقی تعلیمات کے لحاظ سے اتنی بلند ہے کہ اُسے صحیح معنے میں

انجیلِ انسانیت

کہہ سکتے ہیں۔

اس میں مذاہب کی تخلیق، خدا کے تصور، رسالت کے مفہوم، دینی عقاید اور کتب الہامی کی حقیقت پر بسیط تاریخی، علمی، نفسیاتی اور اخلاقی بحث کی گئی ہے۔

حجم ۶۸۲ صفحات۔ کاغذ سفید و دبیز۔ جلد خوشنما۔ قیمت علاوہ محصول سات روپیہ آٹھ آنے (بحر)

مینجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ

مارشل پلان کی حقیقت

مارشل پلان کے متعلق تمام دُنیا کے اخبارات میں مختلف مقاصد پیش کئے گئے ہیں۔ لیکن اس پلان کے اصلی خدوخال بھی ملاحظہ کیجئے:

امریکی کانگرس میں جو مسودۂ قانون پیش ہوا ہے اور جس میں صدر ٹرومین کی سفارشات بھی شامل ہیں اس کی عبارت میں یہ الفاظ بھی شامل ہیں کہ مغربی یورپی ممالک کو جنگی ضروریات کا کچا مال امریکہ کو فروخت کرنے اور امریکہ کے پاس اکٹھا کرنے میں ضرور تعاون کرنا چاہئے، یعنی انھیں امریکہ کو کچا مال سپلائی کرنا چاہئے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یورپ کے مغربی ممالک اور بحیرۂ افیانوس کے اُس پار کی صنعتی طاقت کے درمیان ایک نئی وضع کی تجارت شروع ہوگی۔ صدر ٹرومین کے پیغام میں یہ بھی شرط ہے کہ یورپ کی ۱۶ قوموں کو امریکہ کے سامانِ جنگ جمع کرنے کے ۲۰ کھرب ڈالر کے اخراجات کے پروگرام کو پورا کرنے کا بوجھ بھی اُٹھانا پڑے گا۔ اس پروگرام کو پورا کرنے کے لئے انھیں اپنے ملک کی پوری معیشت اور اس کے ڈھانچے کو بالکل ہی بدل ڈالنا پڑے گا۔ مارشل پلان ان کو اپنے ملک میں بھاری بھاری صنعتیں قایم کرنے کے راستوں کو بالکل بند کر دیتا ہے۔ ٹرومین اپنے پشتی یافتہ ممالک کو صرف ہلکی صنعت قایم کرنے اور کچا مال پیدا کرنے کی اجازت دیتا ہے۔

جرمنی میں اینگلو امریکی مشترکہ علاقوں میں آجکل امریکی اجارہ دار اسی کام میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ اس بات کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ یہ لوگ ان صنعتوں کے کھلنے کے راستہ میں رکاوٹیں ڈال رہے ہیں جن کی پیداوار یورپ اور دنیا کے بازاروں میں امریکی مال کا مقابلہ کرے گی۔ ان لوگوں کے ہاتھوں رائن اور ویسٹ فالیان کے علاقے میں طیار مال پیدا کرنے والوں کی جگہ کچا مال سپلائی کرنے والے بنائے جا رہے ہیں۔

پچھلے سال کے پہلے دس مہینوں میں اینگلو امریکی ایکسپورٹ امپورٹ ایجنسی کے کنٹرول میں اس علاقہ سے باہر جانے والی اشیاء میں ۹۷ فیصدی کچا مال تھا۔ مغربی جرمنی میں جو کچا مال جمع ہوگیا تھا یہ ایجنسی اس میں سے بہت سا مال خرید رہی تھی۔ اسٹیل کی بیکار شدہ اشیاء کی جرمن صنعت کی بحالی کے لئے سخت ضرورت ہے۔ اس ایجنسی نے اسے ۶ ڈالر فی ٹن کے حساب سے خریدا اور ۳۰ اور ۴۰ ٹن فی ڈالر کے حساب سے دُنیا کے دیگر بازاروں میں فروخت کیا۔ ۱۹۴۶ء میں امریکی علاقہ سے ۱۲ ہزار ٹن المونیم باہر بھیجا گیا اور اسے بھی ایسی ہی اونچی قیمتوں فروخت کیا۔ اب امریکہ سے مغربی جرمنی کے اینگلو امریکی علاقہ

میں ایک مشن سستے داموں پر بیکار لوہا خریدنے گیا ہے۔

جرمنی کی صنعت کو ختم کرنے کے تخریبی منصوبوں کو پورا کرنے کے لئے امریکی اور برطانوی اجارہ داروں نے ایک مشترک بلاک بنالیا ہے اور مغربی جرمنی کی معیشت کو اپنے محکوم ملک کی طرح بنا رہے ہیں۔ یہ لوگ مغربی جرمنی کو قرضہ کے جال میں پھانس کر سکہ میں ایسی اصلاحات کر رہے ہیں کہ جس سے جرمنی کا سکہ مارک امریکی ڈالر کی گتھیوں میں اُلجھ کر رہ جائے۔

اس پالیسی کا نتیجہ ہے کہ وزراء خارجہ کی کانفرنس میں امریکی اور برطانوی وفدوں نے سوویٹ یونین کی جرمنی میں اقتصادی وحدت کے قیام اور جرمنی کے مختلف علاقوں کی اقتصادی جماعتوں کو ختم کرنے کی تجویز کی اتنی سخت مخالفت کی۔ مغربی قوتوں کے نمایندوں نے وزراء خارجہ کی کانفرنس کو اس لئے ناکام بنایا کہ جرمنی کا صلحنامہ طیار نہ ہوسکے اور یہ لوگ جرمنی کی تقسیم مکمل کرکے مغربی جرمنی میں بیرونی سرمایہ کی حکومت کو قانونی شکل دیدیں اور مارشل پلان کے حامیوں کو اپنی میں کافی کارروائی کرنے کا موقعہ دیں۔

مارشل پلان پر عمل درآمد کرنے کے لئے صدر ٹرومین کا امریکی کانگرس کو پیغام لندن کانفرنس میں امریکی وفد کی کارروائیوں کے نتائج کا خلاصہ تھا۔ اب مغربی جرمنی باقاعدہ طور پر مارشل پلان کے تحت آگیا ہے اور یہ ایک مثال ہے کہ پیرس کانفرنس میں شرکت کرنے والی ۱۶ ممالک کی حکومتوں کو کن اُصولوں کے ماتحت نشوونما دیجائے گی۔ ٹرومین کا پیغام ان ممالک کی سیاسی اور اقتصادی آزادی کے خلاف زبردست حملہ شروع کرنے کا حکم ہے، یورپ کی اقتصادی بنیادوں پر حملہ ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ یورپ کے ممالک میں بیرونی تجارت سے زبردست خسارہ ہوگا اور بے روزگاری اور مزدوروں اور محنت کش عوام کی غربت میں اضافہ ہوگا۔

مارشل پلان کے متعلق ٹرومین کے پیغام پر تبصرہ کرتے ہوئے امریکی اخبارات نے لکھا ہے کہ یہ امریکی معیشت کا منصوبہ قایم کرنے کی بڑی زبردست کوشش ہے۔ اس منصوبہ بندی کی خاصیت کا اندازہ لگانا ہو تو برطانیہ کی جہاز سازی کی صنعت کی تباہی کے آثار پر غور کیجئے۔

یوروپی ممالک کو امریکی "امداد" کی ایک صورت یہ ہے کہ انھیں بحری جہاز ضرور خریدنے پڑیں گے۔ یہ جہاز امریکہ نے دوران جنگ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے بنائے تھے اور اب امن کے زمانہ میں یہ بیکار ہیں۔ امریکی بندرگاہوں میں بیکار پڑے ہوئے جہازوں کو یوروپی ممالک کے سر تھوپ کر امریکہ یہ توقع کرتا ہے کہ اپنی جہاز سازی کی صنعت کو تباہی سے بچا لیگا اسی کے ساتھ ساتھ اس کا یہ بھی منصوبہ ہے کہ اس طرح یورپ کے ممالک کی اور خاص طور پر برطانیہ کی جہاز سازی کی صنعت کو بھی شدید نقصان پہونچایا جائے۔ اور یہ کون نہیں جانتا کہ جہاز سازی برطانیہ کی بہت بڑی اور اہم صنعت ہے۔

آجکل بھی برطانیہ میں جو بحری جہاز طیار ہو رہے ہیں ان کا تیس فیصدی بیرونی ممالک کو فروخت کر دیا جاتا ہے۔ برطانیہ کو جہازی باربرداری سے بھی بڑی آمدنی تھی اور اسے برطانیہ کی "پوشیدہ برآمد" سمجھا جاتا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں اس سے

برطانیہ کو دس کروڑ پونڈ آمدنی ہوئی تھی۔

برطانیہ کے اخبار "رینالڈس نیوز" (Reynold's News) کی شکایت بجا ہے کہ برطانیہ کی جہاز سازی کی صنعت کم کر دینے کا اثر محض اس صنعت پر نہیں پڑے گا بلکہ اس کے معنے یہ ہوں گے کہ سرد بازاری کے زمانہ کی طرح ایک ہولناک سانحہ ہوگا اور جہازی گودیاں بند ہو جائیں گی اور ہنر مند مزدوروں کی بہت بڑی تعداد بے روزگار ہو جائے گی۔

مارشل پلان میں برطانیہ کی اسکی اتنی بڑی مملکت کے باوجود بھی وہی گت بنتی ہے جو دیگر یوروپی ممالک کی اور برطانیہ کو بھی سامان جنگ کا کچا مال سپلائی کرنے کا اڈہ بنایا جائے گا۔ لندن کی وزراء خارجہ کی کانفرنس شروع ہونے سے قبل امریکہ کے اخبارات میں ایک نعرہ چلائی گئی تھی کہ ——— "جنگی ضروریات کا مال خریدو!"

امریکی مجلس قانون ساز نے بیرونی ممالک کو امداد دینے کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ایک سب کمیٹی مقرر کی تھی۔ اس نے ابھی حال ہی میں ایک بہت بڑی رپورٹ پیش کی ہے اور تجویز کیا گیا ہے کہ برطانیہ کے قبضہ میں جو مختلف معدنیات ہیں ان کو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ مارشل پلان کے قرضہ کا ایک حصہ چکانے کے لئے برطانیہ سے کہا جائے کہ وہ ڈوور کا کچا لوہا، ٹانگانیکا کا سیسہ اور گولڈ کوسٹ کا منگنیز امریکہ کے اختیار میں چھوڑ دے۔

امریکہ کے سب سے بڑے اجارہ دار ہارسٹ (Hearst) کے اخبار ڈیلی مرر (Mirror) نے نہایت صاف صاف الفاظ میں لندن کی وزراء خارجہ کی کانفرنس کو وقت کا ضایع کرنا کہا تھا۔ اس اخبار نے مارشل کو مشورہ دیا تھا کہ وہ سیاسی گفت و شنید کی طرف زیادہ توجہ نہ دیں بلکہ مارشل پلان کے ذریعہ جنگی ضروریات کی اشیاء مثلاً لوہا، اکسائٹ منگنیز کروبیم وغیرہ کا ذخیرہ جمع کرنے کی طرف متوجہ ہوں۔

اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کانفرنس کے دوران ہی میں مارشل پلان اور امریکہ کے جنگی ضروریات کی اشیاء جمع کرنے کے پروگرام میں تعلق قائم کر لیا گیا تھا۔ اب ٹرومین کے امریکی کانگرس کو پیغام سے اس تعلق کی تصدیق بھی ہو گئی اور اس طرح مغربی یوروپی ممالک کو "امداد" دینے کے ڈھونگ کے جنگی مقاصد کا بھی بھانڈا پھوٹ گیا۔

امریکہ ان مقاصد کو چھپاتا بھی نہیں۔ "تمام دنیا میں اڈوں کا ایک سلسلہ" قایم کرنے کی حمایت کرنے والوں کو بھی ٹرومین کے پیغام نے سرگرم عمل ہو جانے کا نعرہ دیا ہے۔ یہ گفتگو اب پھر چھڑ گئی ہے کہ ڈنمارک اپنا مارشل پلان کا قرضہ گرین لینڈ کو فروخت کر کے چکائے۔ سینیٹر میک کارتھی (Senator McCarthy) نے کہا ہے کہ یوروپ کو امریکی امداد کا ایک لازمی جز جنگی اڈوں کا حاصل کرنا ہونا چاہئے۔ اس کام کی ابتدا بھی ہو گئی ہے اور امریکہ نے ہالینڈ سے نیوگنی کے قریب بیاک (Biak) کا جزیرہ بھی حاصل کر لیا ہے۔

امریکی ہر وہ چیز خریدنے کے لئے طیار ہیں جو انھیں سستی ملجائے یا بیکار پڑی ہو۔ پہلے بھی انھوں نے اسپین سے فلوریڈا خریدا تھا، فرانسیسیوں سے وادی سسی سپی اور ڈنمارک سے جزائر ورجینیا۔

اب پھر ڈالر تمام دنیا کا چکر لگا رہا ہے - اور اب کے اسے جنگی اڈوں کی تلاش ہے

مارشل پلان کا دوسرا رخ اور امریکی کانگرس کا ٹرومین کے پیغام سے جو عملی پروگرام بنتا ہے اس سے نہ صرف یہی نہیں کہ مغربی یوروپ کے ممالک کو اپنا محکوم بنا لیا جائے گا اور انھیں امریکہ کی جنگی صنعتوں کو کچا مال مہیا کرنے کا اڈہ بنا لیا جائے گا بلکہ انھیں یورپ میں آیندہ کبھی جنگ ہونے کے منصوبوں کے بالکل ماتحت بھی کر دیا جائے گا۔

یہ ہے مارشل پلان کی روح رواں - اس پلان کے بنانے میں نہ صرف یوروپ کے عوام کے مفاد کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا بلکہ یہ اس کے حقیقی محافظین کے زبردست فوج کو چیلنج ہے - اس پلان پر عمل درآمد کرنے کی عوام سخت سے سخت مخالفت کریں گے کیونکہ انھوں نے فاسسٹ حملہ آوروں کے خلاف اپنی آزادی اور خود مختاری کی حفاظت میں محض اس لئے جان جوکھوں میں نہیں ڈالی تھی کہ غلامی کی ایک زنجیر کی جگہ دوسری بیڑیاں ڈالدی جائیں - (دی - لی نٹیسکی) تاس ایجنسی

دی مغل لائن لمیٹڈ

(سب سے پرانی ہندوستانی جہازراں کمپنی)

بحر احمر اور ماریشس

کی بندرگاہوں کو مسافر اور مال لے جانے والے جہازوں کا بیڑہ بمبئی سے :-

عدن، پورٹ سوڈان، جدہ اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان ہمارے جہازوں کی آمد و رفت باقاعدگی اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے اور امید ہے کہ ہم حسب ضرورت دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے جہاز بھیج سکیں گے

خاص حج سروس

جو حضرات حج کی سعادت حاصل کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں، وہ مندرجۂ ذیل پتہ پر اپنی درخواستیں جلد بھیجدیں - لیکن یہ امر ملحوظ رہے کہ جہاز میں جگہ ملنے کی گارنٹی نہیں دی جا سکتی :-

ٹرنر مارسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۶ - بنک اسٹریٹ - بمبئی

انشاؔ کے دیگر اصنافِ سخن

(اُردو اور دوسری زبانوں میں)

قطعات دیگر اصنافِ سخن کی طرح انشاؔ کے قطعات بھی اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں موجود ہیں جو موضوع کے اعتبار سے بھی گوناگوں مضامین مثلاً تاریخ - تہنیت - دُعا - طعن و تشنیع وغیرہ پر مشتمل ہیں۔

انشاؔ کے قطعات سے ان کی قدرتِ زبان اور لطافتِ بیان کا اظہار ہوتا ہے۔ خاص کر اُن کا ایک فارسی منظوم رقعہ جو کسی ایرانی کے نام ہے۔ بمثیل ہے چند اشعار نقل کرتا ہوں:

تو اے نسیمِ سحر گہ زجانبِ انشاؔ — برو بخدمتِ حاجب علیِ شیرازی
سلام شوق رساں و بگو بعجز و نیاز — کہ می سزد بکمال تو ہر قدر نازی
بنفخہ روح القدس مدد داری — ازاں مسیح زمانی سراسر اعجازی
ہمائے عالم قدسی سہیم توعنقاست — چو طائرانِ بہشت بریں خوش آوازی
قصیدہ و غزل فی البدیہات دیدم — علوّ مرتبہ داری بلند پروازی

تاریخی مادہ نکالنے میں انشاؔ کو کمال حاصل ہے اُن کے جملہ تاریخی قطعات اُصولِ تاریخ گوئی کے مطابق ہونے کیساتھ ہی ساتھ نہایت برجستہ ہیں - دہلی میں نادر شاہی قتلِ عام کے متعلق ایک قطعہ لکھا ہے۔ آخری مصرعہ جس میں مادہ تاریخ ہے یہ ہے:

فقرۂ تاریخ ایں است آہ قتلِ عام شہر

شاہ عالم ثانی المتخلص آفتاب کی وفات کی تاریخ چند فارسی اور اُردو کے قطعات میں کہی ہے۔ ایک قطعہ یہاں نقل کرتا ہوں:

ہے فوت شاہ عالم فخرِ جہانیاں، — وہ غم کہ جس سے ہر بنی آدم کو غم ہوا
دربار سر جھکا کے کہا آفتاب نے — تاریخ بادشاہ کی عالم کو غم ہوا

اکبر شاہ ثانی کی تاریخ اور رنگ آرائی ملاحظہ فرمایئے:

چو انشاؔ خواست تاریخ جلوس ظلِ سبحانی — خرد گفتا بگو شاہ ممالک اکبر ثانی

تہنیتی قطعات بھی انشاء کے خوب ہیں بعض میں تو قصیدہ کی سی شان و شوکت پائی جاتی ہے نواب سعادت علی خاں نے کوئی جشن منعقد کیا تھا اُس کا تہنیتی قطعہ ملاحظہ کیجئے:

آج کے روز ہے وہ دھوم کی شادی انشاء — جس سے آغوشِ وزارت میں رچی بوئے عروس
اہلِ نظارہ کی آنکھوں میں سمائی آکر — فرِ کسریٰ و فریدون و جم و کیکاؤس
یوں زری پوش ہوئی کرسی زرینہ کی گرد — جیسے گلشن میں پھریں جلوہ کناں ہو طاؤس
شرق سے غرب تلک غرب سے لے کر تا شرق — روس سے روم تلک روم سے لیکر تا روس
کوئی سو بار پھرا دے تو نہ دیکھے ایسے — شوکت نوبت شاہانہ و آوازۂ کوس
کیا تعجب ہے اگر دیکھ کے یہ نور و ظہور — گبر دیرینہ ملقب ہو بہ عبدالقدوس
سطوتِ صاحبِ محفل کے نظر آنے سے — بانگ لبیک کہے ساز صدائے ناقوس
ذہن ایسا کہ ارسطو بھی کرے شاگردی — مدرکہ یہ کہ ہو مدرکۂ جالینوس
آسماں تاروں بھری رات کی کھاتا ہے قسم — کہ زہے طالع اگر ہم بھی ہوں یہاں کی فانوس
شکر ہے یہ کہ مراد آج بر آئی صد شکر — چھٹ گئے جتنے کہ تھے قیدِ الم کے محبوس
کشتِ امید تر و تازہ ہوئی خلق کی آج — کوئی اسوقت کسی طرح نہیں ہے مایوس
قدسیاں مستعد آمیں کے لئے ہیں کچھ بول — تا کرے تیری مدد بادشہا کشورِ طوس
ناظم الملک بہادر کو یہ انشاء اللہ — ہو مبارک صد و سی سال تلک جشن مجلوس

مندرجۂ ذیل قطعہ میں شہزادۂ سلیماں شکوہ کو دعا دی گئی:

خداوندا بحق جانشینِ احمدِ مرسل — اسی نوروز میں محکوم روم و روس ہم دیکھیں
فشوں قاہرہ حاضر جلو میں شاہ کے ہووے — کریں گردن کشانِ دہر سب پابوس ہم دیکھیں
پڑھیں خطبہ میں اس کا اسمِ اعظم سکہ ہو جاری — عدو جو کوئی ہو یارب اسے محبوس ہم دیکھیں
عمل اس کا ہو جوں شاہ جہاں بائیس صوبوں میں — گلی میں اپنے بھی ایک خلقتِ ملبوس ہم دیکھیں
دعا مانگے ہے انشاء اللہ اے یارو کہو آمیں — سلیماں کا جلوس میمنت مانوس ہم دیکھیں

انشاء کے قطعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اس صنف کو بڑی خوبی اور عمدگی سے استعمال کیا ہے۔

رُباعیات

اصنافِ سخن میں رباعی کی اہمیت مسلّم ہے اور اس میں کامیاب ہونا ہر شاعر کے بس کی بات بھی نہیں ہے کیونکہ ایک مخصوص بحر کے اندر ایک خیال کو مکمل طور پر چار مصرعوں میں قلمبند کر دینا آسان نہیں ہے، کامیاب

رباعی گو ہونے کے لئے قادر الکلامی، پختگی خیال وغیرہ جیسی صفات کے علاوہ شاعر کے لئے اشد ضروری ہے کہ وہ اس مضمون کے متعلق بھی کوئی پختہ رائے رکھتا ہو جس کو رُباعی میں پیش کرنا چاہتا ہے، مزید براں رباعی کے لئے زبان و بیان پر پوری قدرت ہونا بھی لازمی ہے۔

انشاؔ کے کلیات میں فارسی اور اُردو کی رباعیات کی تعداد وافر ہے جو مناجات، تصوف، رندی، عشق و محبت، زاہد سے چھیڑ چھاڑ وغیرہ مختلف موضوعات سخن پر مشتمل ہیں، ان میں سے اکثر رباعیات ان اوصاف کی حامل ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا لیکن اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ ہم انشاؔ کو خیامؔ یا انیسؔ جیسے رُباعی گو شعراء کی صف میں لاکر کھڑا کرنا چاہتے ہیں کیونکہ خیامؔ یا انیسؔ یا دوسرے فارسی اُردو رباعی گو اساتذہ کا یہ خاص میدان تھا۔ اس کے علاوہ انشاؔ کی رباعیات کا کوئی خاص رنگ بھی نہیں ہے کیونکہ جس طرح ان کے موضوعات بوقلموں ہیں اسی طرح ان کا اسلوب بیان بھی یک رنگ نہیں ہے۔

چند رباعیاں نقل کی جاتی ہیں:-

گزری دُنیا میں خیر جیسی گزری — ہر طرح یہ غم میرا جیسی تیسی گزری
پر واں کی خبر ملی نہ کچھ آج تلک — بیچارے مسافروں پہ کیسی گزری

زاہد کہ بخویش ایں قدر مغرور است — از حوصلہ اش خدا پرستی دور است
خود میداند کہ مایۂ تقوا یش، — امرود و انار و خوشۂ انگور است

یک چند زلفِ دل ربائی کردی — چندے از جور بے وفائی کردی
گردید محال دیدنت ہم الحال، — میدانم دعوائے خدائی کردی

رفتم تہ خاک و دردِ یارم باقی است — وز بادۂ عشق او خمارم باقی است
نرگس روئید بر مزارم چو گیاہ — یعنی کہ ہنوز انتظارم باقی است

جُز جلوۂ او در حرم و دیر نبود، — جُز سیر خودی ہیچ مرا سیر نبود
چوں خوب بچشم غور آنجا دیدم — من بودم و او بود کسے غیر نبود

عالم کے بھی طور ہم نے کیا کیا دیکھے — خوباں کے بھی لطف و جور کیا کیا دیکھے
شادی و غم و وصل و ہجر اے انشاؔ — کیا کیا دیکھیں گے اور کیا کیا دیکھے

کافر یہ کہے ہے حق پرستی سے گزر — ناصح کہتا ہے جوش مستی سے گزر،
انشاؔ مجھ سے جو پوچھو ہیں دونوں پوچ — جھگڑا کہیں چھوٹے اپنی ہستی سے گزر

زاہد جو ہیں انھیں ہے طاعت پہ گھمنڈ — اہلِ دُنیا رکھے ہیں دولت پہ گھمنڈ
واقف ہوں نہ طاعت سے نہ دولت سے میں — ہے مجھ کو اگر تو تیری رحمت پہ گھمنڈ

مخمس انشاؔ نے تمام مروّجہ اور متداول اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ چنانچہ مخمسات کی خاصی تعداد اُن کی کلیات میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ ایک ترجیع بند اور ایک مستزاد بھی ملتا ہے۔ ایک مخمس کا پہلا بند یہ ہے:

میں اپنا دلِ مضمحل بیچتا ہوں، — حیا کس لئے ہو خجل بیچتا ہوں،
نہیں بیچنے میں خجل بیچتا ہوں، — یہ سودا تو دیکھو کہ دل بیچتا ہوں،
لے شیشہ کو زیرِ بغل بیچتا ہوں

عید غدیر کی تہنیت میں مرزا سلیماں شکوہ کی خدمت میں ایک ترجیع بند پیش کیا ہے۔ پہلے دو بند یہ ہیں:

بلطف صفدر ضرغام دیں جناب امیر — چمک کھڑی ہو سلیماں شکوہ کی شمشیر
یہی کہے ہے دعا مانگ ہر صغیر و کبیر — خدا کرے یہ مبارک ہو ایسی عید غدیر
کہ نذر جشن جلوس اب کی سال دیوے وزیر

عجب طرح کا زمانہ کو ہووے عزّ و شرف — کہ شاہ جس میں سلیماں وزیر ہو آصف
صدا بلند ہے اب تو یہی ہر ایک طرف — خدا کرے یہ مبارک ہو ایسی عید غدیر
کہ نذر جشن جلوس اب کی سال دیوے وزیر

مستزاد کے بھی کچھ اشعار نقل کئے جاتے ہیں:

میں نے جو کہا ہوں میں تیرا عاشق شیدا — اے کانِ بلاغت
فرمانے لگے ہنس کے سنو اور تماشہ — یہ شکل یہ صورت
الحاد و تصوف میں جو تھا فرق بہم یاں — اصلا نہ رہا کچھ
پردہ جو تعیّن کا محبت نے اُٹھایا — کثرت ہوئی وحدت
تاثیر ہے کیا خاک میں اس خبط کی کہدے — تو مجھ کو تو مارے
ہر پھر کے جو آ نکلے ہے یاں ناقۂ لیلیٰ — اے جذبِ محبت

انشاء کی شاعری مختلف زبانوں میں آزاد نے لکھا ہے۔ "ہندوستان کی مختلف زبانیں اُن کے (انشاء کے) گھر کی لونڈی ہیں، ابھی پنجاب میں کھڑے ہیں ابھی پورب میں بیٹھے باتیں کرتے ہیں ابھی برج بھاشی ہیں۔ ابھی مرہٹے۔ ابھی کشمیری ابھی افغان۔ سب زبانوں میں کچھ نہ کچھ کہا ہے۔" (آبِ حیات)

انشاء ہندوستان سے باہر کی زبانوں میں بھی کچھ کم مہارت نہیں رکھتے تھے چنانچہ اُن کے کلیات میں بیرون ہندوستان کی متعدد زبانوں میں اشعار ملتے ہیں۔

اُن کے فارسی کلام کے کچھ نمونے گزشتہ اوراق میں ناظرین دیکھ چکے ہیں جس سے اُن کی فارسی دانی اور مہارت بخوبی آشکارا ہوتی ہے۔ آزاد نے کیا خوب لکھا ہے۔ "اگر چند ساعت کے لئے اپنے رفیق طبعی یعنی تمسخر سے جُدا ہوتے اور ذرا زبان کو قابو میں رکھتے تو خدا جانے اپنے زمانے کے خاقانی و انوری ہوتے یا سعدی و خسرو (آب حیات)

عربی زبان پر بھی انھیں فارسی سے کچھ کم قدرت حاصل نہیں تھی ذیل کے دو اشعار ملاحظہ ہوں جن کی عبارت باوجود نظم میں ہونے کے ترکیب، نحوی کے اعتبار سے مقدم موخر نہیں ہونے پائی؛

هو الامام و اهل الولا عسکره　　هو المطاع و هادٍ لکل اهل کلام

هو الامام لکل الورا هو الاعلا،　　مکرم اسد صائل مع الصمصام

ایک اور عربی قطعہ ملاحظہ فرمایئے؛

ربِّ علیٰ رَحمتِکَ الوافیه　　اَسئلکَ الصحّة والعافیه

اَنتَ مغیثُ الفقرا هب لنَا　　عافیةً کافیةً شافیه

اس کے علاوہ ترکی زبان کے اشعار بھی بکثرت اُن کی کلیات میں موجود ہیں، جن کی خوبی و غیر خوبی کو وہی حضرات سمجھ سکتے ہیں جو اس زبان سے واقف ہوں۔ پہیلیاں وغیرہ بھی ترکی زبان میں کہی ہیں۔

پشتو زبان انھوں نے "خالق باری" کے طرز پر فارسی میں سمجھائی ہے۔ یہ چار زبانیں بیرون ہندوستان کی ایسی تھیں جن میں انھیں مہارت کلی حاصل تھی۔ ہندوستان کی زبانیں تو بقول آزاد اُن کے گھر کی لونڈی ہی تھیں۔

کلیات میں ایک مخمس موجود ہے جس میں اُردو۔ فارسی۔ عربی۔ ترکی اور پنجابی پانچ زبانوں میں اشعار رکھے گئے ہیں۔

انشاء جیسی فطانت اور ذہانت والا شخص امیر خسرو کے علاوہ ہندوستان کی ادبی و علمی تاریخ میں اور کوئی نظر نہیں آتا۔ یہی نہیں کہ انشاء ہر مروجہ صنف سخن میں شعر کہنے پر قادر تھے اور بیرون ہندوستان کی بعض زبانوں میں مہارت کلی رکھتے بلکہ اس کے علاوہ اُن کا کلیات ایسی چیزوں سے بھی پُر ہے جن کو دیکھ کر انشاء کی طباعی اور ذہانت کی داد دینا پڑتی ہے۔ انشاء کی ذات میں اتنے گوناگوں کمالات جمع ہو گئے تھے کہ اُن سب کا فرداً فرداً جایزہ لینا بھی دشوار ہے۔ تاہم کوشش کی جائے گی کہ اُن کے اکثر کمالات کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔

معمے۔ انشاء نے مختلف زبانوں میں معمے نظم کئے ہیں۔ چند یہ ہیں:۔

(۱) چوں سشدم من گرسنہ بغداد را آتش گرفت　　بر جہائے گلشن شداد را آتش گرفت

(۲) کیست آں مرد مسلماں بندۂ پروردگار　　آنکہ نامش ہست در قرآں بتصریح آشکار

(۳) صورتِ آدم میں عالم ہے خدا کے نور کا وہ پری غلماں سا مکھڑا اور جھمکڑا حور کا

یہ معمات خود حل فرمائیے۔

چیستاں - چیستانیں بھی مختلف زبانوں میں کہی ہیں، بھٹے کی چیستاں ملاحظہ فرمائیے:

مشتے گہر گرفتہ مناز اینقدر بخویش کایں لقمہ از دہاں تکبر زیادہ است
مردے سفید پوش کہ ریش دراز داشت باحلہائے سبز در آتشِ فتادہ است

پہیلی - پہلیاں فارسی اُردو اور ہندی زبانوں میں ہیں۔ گھوڑے کی ہندی پہیلی ملاحظہ فرمائیے۔

مونھ میں ناہر بیٹھے جیسے مرگ ایسو اُچھلے جیسے درگ
بگلا طوطا وا کے سنگ اور بہت سے آہ میں رنگ

مشک کی ہندی پہیلی بھی خوب ہے:

باس سو باس اور سگری مار سیدھا او مسکا تار تیار
پہاڑ سے الٹو ڈالوں مار کود ہوں عربی یا نر دھار
گیہوں او بچے وا کے بیچ سو چو تو یا اونچ اور نیچ،

اُردو میں لفظ "آب" کی پہیلی بہت اچھی ہے:

پانی مار اور پانی باپ اُس کا اشارہ بوجھیں آپ

لفظ "آہ" کی پہیلی بھی دلچسپ ہے:-

ہے نصف تو اسم ذات کی سی صورت دن کی صورت نہ رات کی صورت
کام آوے وہ درد میں جو لکھئے انشاء تو ہو قلم و دوات کی سی صورت

پہیلیاں مستزاد - "مستی" اور "بتی" کی دو پہیلیاں نقل کی جاتی ہیں تعریف سے بالا ہیں:-

جا بیگموں کے مونھ لگی ایک کالی سی حبشن دونا کرے جوبن وہ کیا اری سوسن
لوہے کی جنی ہووے اُسے سب کہیں تانبا صورت میں پری سی وہ یعنی کہ مستی
تاروں کی بنائی ہوئی ایک ناگنی ایسی سر جس کا سنہرا ایک رات میں ظالم
پیجاوے جو تالاب بھی ایک سارے کا سارا یعنی کہ جلائی ہے تو جو وہ بتی

مقطعات طلسمات - طلسمات کے نسخے بھی ملاحظہ فرمائیے:

عرق لیمو آدھے شیشے میں کہدے ایک آدمی سے بھر لاوے
اس میں ایک چٹکی بھر کف دریا پیسکر چھوڑ دے تو اے پیارے

اُبل آوے گا وہ عرق منہ تک — سانپ کی طرح مار پھنکارے
یہ عجائب طلسم ہے انشاؔ — دیکھ جس کو بھچک رہیں سارے

لکھے جو خط عرق سے لیموں کے — سادہ معلوم ہوئیگا بس خمیر
آگ پر دھرتے زعفرانی حرف — نکل آویں گے ہے عجائب سیر

خطوط منظوم ۔ انشاؔ کو مسلسل نظم اور خصوصاً منظوم خطوط لکھنے میں کمال حاصل تھا اُن کے کلیات میں ایسے متعدد خطوط موجود ہیں۔ یہاں اُن کا مختصر ترین خط نقل کیا جاتا ہے جو اُن کے کمال فصاحت و بلاغت کا ثبوت ہے:

میرزا صاحب الطاف نشاں سلمہٗ — بعد اظہار تمنّا یہ اجی ہو معلوم
اتنے مدت سے سدھارے نہ کبھی خط لکھا — ہمکو ایک پیسے کے کاغذ سے بھی رکھا محروم

صرف چار مصرعوں میں القاب آداب ۔ رسمی اشتیاق ملاقات ۔ اور شکایت پر مبنی خط کا مضمون قلمبند کر دینا انشاؔ ہی جیسے بلیغ شاعر سے ہو سکتا تھا۔

متفرق کمالات ۔ صیغہ نکاح جو نثر میں ہے اس پر سوائے انشاؔ کے کسی نے غور نہیں کیا کہ اس کی عبارت تمام و کمال بحر و وزن کے اندر ہے ۔ انھوں نے پورے صیغہ کو ایک مصرعہ بنا کر تین مصرعے اور زاید کئے ہیں اور صنعتِ منظوم النثر میں ایک رباعی طیار ہو گئی جو یہ ہے:

آرام و نشاط و عیش کردند ہجوم — ایجاب و قبول جلگی شد مرقوم
با دختر زر پیرِ مغاں عقد دم بست — قد قلت قبلت بالصداق المعلوم

روزہ کی عرف عام نیت بھی ایک رباعی میں کھپائی ہے:

بہاتا ہے بھوک پیاس سب کچھ سہنا — اور روزہ میں انتظار مغرب رہنا
آپس میں سحر گہی کی چہلیں اور پھر — " بالصوم غداً نویتُ " ان کا کہنا

صنعت بے نقط میں اُن کا ایک پورا دیوان اور ایک مثنوی موجود ہے اور گزشتہ صفحات میں جگہ جگہ جس کے نمونے ناظرین مطالعہ کر آئے ہیں یہاں اسی قبیل کی مختلف صنعتوں کے اشعار نقل کئے جاتے ہیں:

آہ کل دل کو ہوا درد کہ رکھا ہم کو — جنبشِ چینِ جبینِ بتِ چیں نے بیچین

مندرجہ بالا شعر میں پہلا مصرعہ بالکل بے نقط ہے اور دوسرا مصرعہ بالکل منقوط۔
ایک اور شعر ملاحظہ کیجئے:

شہ بلند نسب اب مجھے سبھی دیوے — جبینِ لامِ زینت حصولِ جشن مرام

مرقومۂ بالا شعر کا پہلا مصرعہ صنعت رقطا میں ہے یعنی پہلا حرف بانقط اور دوسرا بے نقط اور دوسرا مصرعہ صنعت خیفا

میں ہے یعنی اس میں ایک لفظ اگر بانقطہ ہے تو اس کے بعد آنے والا لفظ بے نقطہ ہے۔[1]

صنعت بے نقط میں نثر لکھنے پر بھی قادر تھے ایک جملہ نقل کیا جاتا ہے:۔

"الحمد وللہ کہ آس مراد کا گل کھلا۔ عطر سہاگ کا لگا کر ابلا گہلا وہ ماہرو دولہہ سا ہو کر امرِ دکم عمر سادہ سادہ ملک ماہرو ہمراہ ملکہ گوہر آرا وارد آرام محل ہوا ۔۔۔۔"

بحر طویل میں میاں مصحفی کی ہجو لکھی ہے قدرے ابتدائی عبارت نقل کی جاتی ہے:۔

"بخداوندے شرفے کہ رحیم است وکریم است وعلیم است وحلیم است وحکیم است وعظیم است وسلیم است و قدیم است وشریف است ولطیف است وخبیر است وبصیر است ونصیر است وکبیر است ورؤف ست وغفور است و شکور است و ودود است ۔۔۔۔۔۔۔۔"

صنعت محتمل اللغات (یعنی ایک ہی فقرہ کئی زبانوں میں مختلف المعانی) میں ایک مصرعہ کہا ہے جو عربی، فارسی اور ہندی تینوں زبانوں میں بامعنے ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

دلا دو مصرعہ کہکر ملک کو کر سامع — اور اُس کا مصرعہ اول ہو مصدر سہ کلام

بیا بیا حب من حالیا بیا کی باش — پیا پیا جب من جا لیا پیا کی باس

بیا ننا حُب من جا لنا سا کی ناس — کہ مدح سرور والا سرودہ ام سرعام

اس قطعہ کا پہلا شعر صنعت بے نقط میں ہے۔ تیسرا مصرعہ فارسی اور چوتھے مصرعہ میں نکتوں کے ردو بدل سے یہی مصرعہ ہندی ہوگیا ہے۔ اسی طرح پانچویں مصرعہ میں یہی عبارت عربی ہے۔ چھٹا مصرعہ پھر صنعت بے نقط میں ہے۔

ملحوظ رہے کہ صنعت محتمل اللغات میں امیر خسرو نے پانچ الفاظ کا نثر میں ایک جملہ لکھا تھا جو عربی، فارسی اور ہندی میں پڑھا جاتا تھا جس کی عالم میں دھوم مچ گئی تھی انشاؔ نے انھیں تینوں زبانوں میں پورا ایک مصرعہ کہہ دیا۔

درحقیقت امیر خسرو کے بعد اگر کوئی جامع کمالات ہندوستان میں پیدا ہوا تو وہ انشاؔ تھا اس لئے اگر اُسے خسرو ثانی کہا جائے تو عین مناسب ہے۔

خلاصہ کلام ۔ ایک نقاد نے انشاؔ کی جامعیت کو ترشے ہوئے نگینہ سے تشبیہ دی ہے جس کے مختلف پہل ہوتے ہیں لیکن میں کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ اُن کی جامعیت فن کے اعتبار سے جتنی مسلم ہے اتنی شخصیت کے اعتبار سے نہیں ہے اُن کی

---

[1] انشاؔ کی کلیات میں بعض ایسے اشعار بھی پائے جاتے ہیں جن میں یکدم چند مشکل ترین صنعتیں جمع ہوگئی ہیں مثلاً ایک ہی شعر صنعت بے نقط میں بھی ہے اور اسی میں صنعتِ مقلوب مستوی یا کبھی صنعتِ مقلوب کل نقطہ میں بھی موجود ہے اس قسم کے تمام اشعار نقل کرنا بڑا طول عمل ہے، ناظرین کو کلیات کی جانب متوجہ ہونا چاہئے۔

شاعری میں کسی خاص مطمح نظر یا زندگی کے لئے کوئی مخصوص لایحہ عمل یا نفع انسان کے لئے کوئی پیغام تلاش کرنا بے سود کوشش ہوگی اس چیز سے نہ صرف انشاء کی شاعری بلکہ اُن کے عصر کے تمام شعراء کا کلام عاری ہے۔ انشاء کی شاعری پر ایک عام اعتراض یہ ہے کہ وہ رندانہ ہے اور اس میں ہزلیات اور مزخرفات کی بہتات ہے۔ یہ اعتراض ایک حد تک ضرور صادق آتا ہے لیکن اُن کی تمام شاعری پر حاوی نہیں۔ گزشتہ اوراق میں مختلف اصناف سخن کے تحت ہم دیکھ آئے ہیں کہ سنجیدہ مضامین کو سنجیدہ الفاظ میں ادا کرنے کی صلاحیت بھی انشاء میں موجود تھی لیکن یہ تسلیم کرنے میں ہمیں تامل نہیں ہے کہ اُن کا اکثر کلام تمسخر۔ حد سے سوا شوخی اور سستے قسم کی ظرافت سے ملوث ہے تاہم جو جدت اور شگفتگی انشاء کے کلام میں ملتی ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔

دوسرا عام اعتراض انشاء پر یہ ہے کہ اُن کا کلام ہر مقام پر قابلِ سند نہیں ہے اور اُس سے قواعد۔ محاورات اور شاعری کے اُصول مجروح ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے قواعد کی پابندی اکثر نہیں کی الفاظ اور محاورات میں بھی تصرف کیا لیکن اُن کی یہی چیز ایک اور نقطۂ نظر سے عیب کے بجائے صواب میں ہو سکتی ہے۔ انشاء سے زیادہ زبان کے اُصول و قواعد جاننے والا دوسرا کون ہو سکتا تھا؟ چنانچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جہاں کہیں اُصول و قواعد سے انحراف کیا گیا ہے اس کی بناء انشاء کی علمی کم مائگی تھی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ انشاء کو اپنے اجتہاد اور زبان کی لسانی خوبیوں اور سہولتوں پر اس درجہ اعتماد تھا کہ اُن کو زبان و بیان کے مروجہ حدود سے گزر جانا کبھی مشکل یا نادرانہ معلوم ہوا۔ بڑی ہستیاں دُنیا میں حدود توڑنے اور وسعتیں پیدا کرنے ہی کے لئے آتی ہیں ایسا نہ ہو تو یکسانی فرسودگی تعطل سے یہ سارا کارخانہ درہم برہم ہو جائے۔ الفاظ اور محاورات میں تصرفات زبان کی توسیع کے لئے بے انتہا مفید ہوتے ہیں اور انشاء نے زبان کو وسیع کرنے میں بڑی وسعت نظر اور اعتماد سے کام لیا ہے اور بہت سے نئے تجربات کئے اسی لئے اُن کا کلام متنوع ہے۔ انشاء نے اُسی کام کو آگے بڑھایا جو کام سودا شروع کر چکے تھے یعنی لفظ سازی وغیرہ کے ذریعہ ذخیرہ الفاظ بندش و تراکیب میں اضافہ کرنا، اس طور پر انشاء کو سودا کا معنوی شاگرد قرار دیا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ انشاء کی شاعری بھی سودا کی طرح ملکی خصوصیات اور ہندی تلمیحات سے مالا مال ہے۔ اسکے علاوہ ہندی کے بعض عام فہم اور خوشنما الفاظ انشاء کے کلام میں ایسے بھی موجود ہیں جو اُن کے معاصرین متروک ٹھہرا چکے تھے۔ انشاء چونکہ سودا سے زیادہ زبانیں جانتے تھے اور ہندوستان کی متعدد زبانوں سے واقف تھے اس لئے انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ اُردو میں بہ تعداد کثیر نئے الفاظ کھپائے جو اُردو کو وسعت دینے کے علاوہ اُسے پورے ہندوستان کی زبان بنانے میں معاون ہوئے۔ انشاء کی یہ کوشش خود اُن کے زمانہ میں سراہی نہیں جا سکتی تھی کیونکہ اُسوقت کی عام روش اُردو سے دیگر صوبجاتی زبانوں اور ہندی کے الفاظ کو خارج کرنے کی تھی۔ متروکات کا زور تھا اور زبان کا دائرہ محدود کیا جا رہا تھا یہ تحریک دراصل تخریب تھی جو ناسخ کے زمانہ میں مکمل ہو گئی۔ اس لئے انشاء کا عام روش سے علٰحدہ ہو کر زبان کو محدود کرنے کے بجائے وسیع کرنا اُن کے معاصرین کی نظروں میں مستحسن نہیں ہو سکتا تھا انشاء کی اس کوشش کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ موجودہ عصر کر سکتا ہے اور کر رہا ہے۔

رہی نثر تو اُس کا بھی "رانی کیتکی کی کہانی" میں انشاؔ ایک ایسا نمونہ پیش کر گئے ہیں جس کی اہمیت کا اندازہ آج بخوبی کیا جا سکتا ہے، دراصل انشاؔ کی یہ کوشش اس حقیقت کی طرف صاف اشارہ ہے کہ ایک عام فہم اور مشترک ملکی زبان کا تصور اُن کے ذہن میں بسا ہوا تھا۔ "اُردو لسانیات" پر وہ ایک ایسی جامع کتاب ہمیں دے گئے ہیں جو نہ صرف انشاؔ کا شاہکار ہے بلکہ وہ ایسا مفید کارنامہ ہے کہ اُردو زبان اور ادب اُن کا جتنا بھی شکر گزار ہو وہ کم ہے، ایسا وقت آسکتا ہے کہ لوگ انشاؔ کی شاعری سے بیزار ہو جائیں، اُن کے لطائف و ظرائف میں دلچسپی نہ لیں اور اُن کی نثر کو نظر انداز کر دیں۔ لیکن "دریائے لطافت" کی اہمیت کسی زمانہ میں اور کسی حالت میں کم نہیں ہوگی۔ رحمت نبی خاں ایم۔اے

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے والی

انجیلِ انسانیت

"من و یزداں"

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دورِ تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ۔ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوعِ انسانی کو "انسانیتِ کبریٰ و اخوتِ عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔ اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقاید، رسالت کے مفہوم اور صحایفِ مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پُرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔

ضخامت ۶۷۲ صفحات۔ مجلد۔ قیمت سات روپیہ آٹھ آنہ

علاوہ محصول

گرد و پوش رنگین کاغذ سفید و دبیز

منیجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ

"نگار" کے پُرانے پرچے

سنہ ۲۶ء جنوری = ۱۲ر۔ سنہ ۳۰ء مئی = عہ ر۔ سنہ ۳۱ء جولائی، اگست فی پرچہ ۸ر۔ اکتوبر تا دسمبر فی پرچہ ۸ر۔ سنہ ۳۲ء فروری، مارچ فی پرچہ ۱۲ر۔ مئی، جون، جولائی فی پرچہ ۸ر۔ ستمبر و نومبر فی پرچہ ۸ر۔ سنہ ۳۴ء فروری، مارچ، مئی، جون، ستمبر، اکتوبر، نومبر فی پرچہ عہ ر۔ سنہ ۳۶ء۔ دسمبر عہ ر۔ سنہ ۳۷ء فروری، تا جولائی فی پرچہ ۸ر۔ اکتوبر، نومبر فی پرچہ ۱۲ر۔ سنہ ۴۰ء فروری تا دسمبر (جون، جولائی، اگست نہیں ہے) فی پرچہ ۸ر۔ سنہ ۴۱ء مارچ تا دسمبر (ستمبر نہیں ہے) للعہ۔ سنہ ۴۲ء مارچ تا مئی فی پرچہ ۸ر۔ اگست، ستمبر، اکتوبر و نومبر فی پرچہ ۸ر سنہ ۴۳ء مئی ۱۲ر۔ ستمبر تا دسمبر فی پرچہ ۱۲ر۔ سنہ ۴۴ء مئی تا دسمبر مسلسل فی پرچہ ۱۲ر۔ سنہ ۴۵ء اپریل ۸ر، مئی عہ ر۔ جون، جولائی فی پرچہ ۱۴ر اگست تا دسمبر ۸ر فی پرچہ۔ سنہ ۴۶ء اپریل تا اگست فی پرچہ ۸ر۔ ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر فی پرچہ ۱۲ر۔ (مکمل فائل سنہ ۴۶ء = ۱۰ر)

سنہ ۴۷ء جنوری (ماہ دولین نمبر) ایک روپیہ آٹھ آنہ ——

سنہ ۴۸ء جنوری، فروری (پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر۔ تین روپیہ ——

سنہ ۳۱ء جلد دوم جولائی تا دسمبر۔ سے ر۔ سنہ ۳۲ء، سنہ ۳۹ء، سنہ ۴۱ء، سنہ ۴۲ء سنہ ۴۳ء، سنہ ۴۴ء، سنہ ۴۵ء، سنہ ۴۶ء کی مکمل جلدیں پورے سال کی بارہ روپیہ فی فائل مجلد۔ علاوہ محصول۔

منیجر نگار لکھنؤ

فلسطین اور تحریک صیہونیت[1]

جس زمانہ میں فلسطین، ترکی حکومت میں شامل تھا، یہودی اور عرب دونوں نہایت امن وسکون کی زندگی بسر کر رہے تھے اور ان میں کسی قسم کا اختلاف نہ پایا جاتا تھا۔ دونوں آزادی سے اپنی اپنی عبادت گاہوں میں عبادت کرتے تھے، آپس میں محبت وخلوص کے ساتھ ملتے جلتے تھے اور ترکی حکومت ان کے ساتھ بڑی رواداری برتتی تھی۔ اسوقت یہود آبادی یہاں ۵۰ ہزار تھی اور چونکہ وسطی یا مشرقی یورپ کے یہودیوں کا اثر ان پر نہ پڑا تھا اس لئے وہ نہ صیہونیت کی تحریک سے واقف تھے اور نہ ان میں اپنی جداگانہ حکومت قایم کرنے کا کوئی جذبہ پایا جاتا تھا ـــــ لیکن اب یہاں یہودی آبادی ۶ لاکھ ہے جو تقریباً سب کی سب صیہونی ہے اور فلسطین میں اپنی حکومت قایم کرنا چاہتی ہے۔

صیہونی تحریک یوں تو ۱۸۹۶ء ہی میں شروع ہوگئی تھی، لیکن وہ بالکل بیجان چیز تھی، جب ۱۹۱۴ء کی جنگ شروع ہوئی تو حالات بدلے اور انگریزوں کو ضرورت ہوئی کہ وہ یہود وعرب دونوں کو خوش رکھیں۔ یورپ کے یہودیوں سے تو انھیں مالی امداد مل رہی تھی اس لئے ان کا خوش رکھنا ضروری تھا اور عربوں سے وہ وعدہ کر ہی چکے تھے کہ ترکی کے خلاف جو مدد ان سے ملیگی اس کے صلہ میں وہ عربوں کی پانچ آزاد حکومتیں علٰحدہ علٰحدہ قایم کردیں گے، جن میں ایک حکومت فلسطین کی بھی ہوگی، چنانچہ اسی سلسلہ میں انگریزوں کی طرف سے ۱۹۱۷ء میں اس پالیسی کا اعلان کیا گیا جسے "Balfour declaration" کہتے ہیں۔ اس اعلان کی رو سے انگریزوں نے یہ تو تسلیم کرلیا تھا کہ تمام وہ یہودی جو یورپ میں نہیں رہ سکتے، فلسطین کو اپنا وطن بنا سکتے ہیں لیکن اس میں یہودی حکومت کے قیام یا صیہونی تحریک کا کوئی ذکر نہ تھا۔

جب لڑائی ختم ہوئی تو عرب میں ان پانچ آزاد حکومتوں کے قیام کا سوال سامنے آیا، جس کا وعدہ کیا گیا تھا اور اعلان بالفور کی پوری پابندی نہ کرتے ہوئے، بجائے پانچ کے صرف تین حکومتیں، (عراق - عرب - شرق یردن) قایم کی گئیں اور فلسطین کے متعلق یہ فیصلہ کیا گیا کہ وہ انجمن اقوام سے متعلق رہے گی اور امریکہ کو اس کی سیادت سپرد کی گئی، لیکن جب امریکہ نے اس کو قبول نہ کیا

---

[1] "صیہونیت" کو انگریزی میں "Zionism" کہتے ہیں۔ یہ یہود قومیت کی وہ تحریک ہے جو ۱۸۹۶ء میں Zionist organisation کے نام سے شروع ہوئی اور جس کا مقصود فلسطین میں یہودی حکومت قایم کرنا ہے۔ "Zion" اس پہاڑی کا نام ہے جس پر یروشلیم (بیت المقدس) آباد ہے اور اسی نسبت سے یہاں کے یہودی Zionist کہلاتے ہیں۔

تو برطانیہ نے یہ ذمہ داری اپنے سر لیلی۔

چونکہ اعلان بالفور کی رو سے یہودی فلسطین میں آکر قیام کرنے کے لئے آزاد تھے، اس لئے انھوں نے یورپ کے مختلف حصوں سے یہاں آنا شروع کیا۔ اول اول تو یہاں کے عرب اس کو خاموشی سے دیکھتے رہے، لیکن جب ۱۹۳۶ء میں یہودیوں کی آمد بہت بڑھ گئی تو عربوں کو فکر پیدا ہوئی اور انھوں نے اس تحریک کے مقابلہ میں ہتھیاروں سے کام لینا شروع کیا اور برابر تین سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ لیکن جب ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو عربوں نے یہ جدوجہد روک دی کیونکہ اب یہودی جرمنی کے خلاف برطانیہ کی مدد کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے اور فلسطین میں ان کی آمد کم ہو گئی تھی۔

جنگ ختم ہونے کے بعد برطانیہ نے وہائٹ پیپر کے نام سے ایک اعلان شایع کیا اور اس کی رو سے اپریل ۱۹۴۴ء تک یہودیوں کی آمد فلسطین میں ۷۵ ہزار تک محدود کر دی، لیکن چونکہ یہ اعلان، پچھلے اعلان (بالفور) کے خلاف تھا اس لئے یہودی بگڑ گئے اور انھوں نے برطانیہ کے خلاف جارحانہ طرز عمل اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہتھیاروں کی ان کے پاس کمی نہ تھی کیونکہ مقبر اور یورپ کی طرف سے خفیہ طور پر ان کو پہونچتے رہتے تھے اور جنگ سے واپس آنے والے بہت سے یہودی تربیت یافتہ سپاہی کی حیثیت رکھتے تھے، اس لئے انھوں نے پوری دہشت انگیزی سے کام لینا شروع کیا۔ پولیس چوکیوں پر حملہ کرنے لگے دفتروں کو جلانا شروع کیا اور بڑے بڑے افسروں کو ہلاک کرنے فکریں کرنے لگے۔ یہاں کے عرب یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور خوش تھے کیونکہ اب خود حکومت یہودیوں کے مقابلہ میں آگئی تھی، علاوہ اس کے عربوں کو ایک فایدہ یہ بھی پہونچ رہا تھا کہ وہ اِدھر اُدھر سے چرائے ہوئے اسلحہ گراں قیمت پر یہودیوں کو مہیا کر رہے تھے اور مفتی اعظم حسینی کے چلے جانے کی وجہ سے یہاں کے قبیلوں میں اتحاد و اتفاق بھی باقی نہ رہا تھا۔

بہرحال یہ دہشت انگیزی اسی طرح جاری رہی یہاں تک کہ ۲۲ جولائی ۱۹۴۶ء کو یہودیوں نے زیادہ جارحانہ قدم اُٹھایا اور برطانیہ کے فوجی ہیڈ کوارٹر کو اُڑا دیا جس میں تقریباً سو آدمی ہلاک ہوئے۔ اس واقعہ نے عربوں کو چونکا دیا اور انھوں نے فیصلہ کیا کہ اگر برطانوی سیادت امن و امان قایم نہیں رکھ سکتی تو وہ اپنی حفاظت کا مسئلہ خود اپنے ہاتھ میں لیں گے۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ایک طرف یہودیوں نے یہ عزم کر لیا ہے کہ وہ فلسطین کو اپنا وطن بنا کر اپنی بڑی سی بڑی آبادی وہاں قایم کریں گے خواہ اس کا نتیجہ کتنی ہی بڑی خونریزی و بدامنی کیوں نہ ہو۔ دوسری طرف عرب اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہودیوں کا یہ سیلاب اگر نہ رُکا تو نہ صرف فلسطین بلکہ تمام سرزمین عرب پر وہ چھا جائیں گے اور عربوں کی اقتصادی و سیاسی زندگی دونوں خطرہ میں پڑ جائے گی۔ برطانیہ کی پوزیشن بہت نازک ہے۔ وہ نہ عربوں سے بگاڑنا چاہتا ہے، نہ یہودیوں سے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ روس کا خطرہ بحر روم اور مشرق ادنیٰ میں بڑھتا جا رہا ہے اور اس کا مقابلہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ دونوں خوش رہیں، جس کا اب کوئی امکان نہیں۔

اِدھر عرب لیگ نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ یہودیوں کو کامیاب نہ ہونے دیں گے خواہ کتنی ہی بڑی قربانی کیوں نہ کرنا پڑے

اور اُدھر یہودیوں کو اٹلی، امریکہ وغیرہ سے ہر طرح کی امداد پہونچ رہی ہے اس لئے لڑائی تو اب رُکتی نہیں، لیکن اگر لڑائی چھڑ گئی اور کوئی دوسرا ملک شریک نہ ہو تو کیا عربوں کی کامیابی کی توقع کی جا سکتی ہے یا نہیں - یہ مسئلہ ذرا غور طلب ہے -

عرب لیگ کے سکریٹری جنرل اعظم پاشا نے حال ہی میں اپنی ایک تقریر کے دوران میں ظاہر کیا ہے کہ "خواہ دس سال صرف ہوں یا پچاس سال، ہم مشرق وسطی سے غیر عربوں کی سیادت و ملوکیت کو ختم کئے بغیر نہ رہیں گے خواہ وہ امریکہ ہو یا برطانیہ، روس ہو یا فرانس یا کوئی اور"۔

یہ تقریر اعظم پاشا نے اس موقعہ پر کی تھی جب عرب لیگ کی ایک کانفرنس میں تقسیم فلسطین کے خلاف فوجی کارروائیوں پر غور کیا جا رہا تھا اور اس تقریر سے ظاہر ہے کہ اہلِ عرب یقیناً جنگ کے لئے آمادہ ہیں، لیکن محض اس لئے کہ اُن کی آبادی یہودیوں سے زیادہ ہے، ان کی کامیابی کا یقین نہیں کیا جا سکتا، جبکہ اس سے قبل کے تجربات زیادہ امید افزا نہیں ہیں اور موجودہ فنونِ جنگ کی واقفیت کے لحاظ سے وہ یہودیوں کے مقابلہ میں کافی کمزور ہیں -

۱۹۴۱ء میں جب عراق میں برطانیہ کے خلاف اور نازیوں کی موافقت میں فوجی سرگرمی شروع ہوئی تو برطانیہ کی بہت مختصر سی فوج نے ہوائی دستوں کی مدد سے چند ہفتوں میں عراقی فوج کو شکست دیدی، حالانکہ اس عراقی فوج نے برطانیہ ہی سے تربیت حاصل کی تھی -

۱۹۲۰ء میں جب ابن سعود کی فوجیں عراق اور شرق یردن میں داخل ہوئیں تو صرف چند ہوائی جہازوں نے اُن کے پاؤں اُکھیڑ دئے گئے اور نوک دم انھیں بھاگنا پڑا -

سب سے بڑی فوج مصر کی ہے جس کا اندازہ ایک لاکھ کیا جاتا ہے، لیکن ماہرین جنگ مصری فوج کے زیادہ قایل نہیں ہیں کیونکہ تجربہ بتاتا ہے کہ جب کبھی مصر نے اپنی فوجی طاقت بڑھانے کا خیال تو بھرتی ہونے والوں میں نصف سے زیادہ ایسے ہوتے تھے جو اپنی صحت کے لحاظ سے فوج میں شامل نہ ہو سکتے تھے - لیکن اس سے بھی زیادہ جس بات کا خطرہ ہے، وہ یہ ہے کہ خود ان کے مختلف قبایلی سرداروں کے دماغ میں حکومت کا سودا سمایا ہوا ہے اور ان میں سے ہر ایک یہ چاہے گا کہ افواج متحدۂ عرب کی کمان اس کے ہاتھ میں ہو -

اس قیادت کے سب سے زیادہ متمنی شاہ فاروق ہیں، لیکن ان کو لڑائی کا تجربہ نہیں اور نہ ان کی عمر اتنی کہ شیوخ عرب ان کی سرداری کو تسلیم کر لیں - دوسرا شخص جو اس خدمت کا مدعی ہو سکتا ہے، ابن سعود ہیں اور اس میں شک نہیں کہ وہ اس کے مستحق بھی ہیں - لیکن ان کا سیاسی ماضی زیادہ اطمینان بخش نہیں - ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں، اپنے غیر جانبدار رہنے کا معاوضہ انھوں نے پانچ ہزار پونڈ سالانہ برطانیہ سے وصول کیا، لیکن حجاز میں ہاشمی خاندان کی حکومت کا قیام ان کو بہت ناگوار ہوا اور آخر کار انھوں نے شاہ حسین کو جو برطانیہ کا ساختہ پرداختہ تھا نکال کر حجاز پر قبضہ کر لیا - دوسری جنگ عظیم سے قبل جرمنی، اطالیہ اور جاپان نے سعودی عرب کے بڑ دلی چشمے حاصل کرنے کی کوششیں کر رہے تھے اور یہ کسی سے انکار بھی نہ کرتے تھے، لیکن اسی

کے ساتھ امریکہ سے بھی خفیہ گفتگو جاری تھی اور جب امریکہ نے ۵ لاکھ پونڈ سالانہ ادا کرنے اور نفع میں شریک کرنے کا بھی وعدہ کیا تو انھوں نے امریکہ کو ٹھیکہ دیدیا۔ ہرچند عرب لیگ میں شامل ہونے والی دوسری حکومتوں نے سخت مخالفت کی، لیکن ابن سعود نے کسی کی نہ سنی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب سعودی عرب میں امریکہ کے اثرات بہت قوی ہو گئے ہیں۔

اس لئے اگر فلسطین کے مسئلہ میں جنگ شروع ہوئی تو ابن سعود مشکل ہی سے امریکہ کے خلاف قدم اُٹھائیں گے جو تقسیم فلسطین کا سب سے بڑا خواہشمند ہے۔

تیسرے شخص شاہ عبداللہ والی شرق یردن ہیں جو عرب ریاستوں کی سیادت کے مدعی ہیں، لیکن انکا نقطۂ نظر عرب آزادی کے متعلق یہ ہے کہ وہ شمالی عرب کو (جس میں شام، فلسطین اور شرق اردن شامل ہیں) جنوبی عرب سے علٰحدہ کرکے یہاں ایک مستقل حکومت قایم کرلیں اور ابن سعود و شاہ فاروق اچھی طرح واقف ہیں کہ عبداللہ کو برطانیہ کی امداد حاصل ہے اور اس کی فوج برطانوی افسران کے زیر ہدایت تربیت پا رہی ہے۔ اس لئے اگر شاہ عبداللہ کو عرب لیگ کی فوجوں کی سیادت ملگئی تو شاہ فاروق اور ابن سعود مشکل ہی سے اسے تسلیم کریں گے۔

اس سلسلہ میں ایک اور شخص طلحہ ہاشمی پاشا کا بھی نام لیا جاتا ہے جو ہاشمی خاندان کا سردار ہے، لیکن چونکہ ابن سعود کی مخالفت ہاشمی خاندان سے بہت قدیم ہے، اس لئے شاید ہی وہ اس کو تسلیم کریں۔

عربوں نے اپنی جگہ یہ طے کیا ہے کہ آیندہ موسم گرما میں جب انگریزی فوجیں فلسطین کو خالی کردیں گی، تو یہ اپنی فوجیں فلسطین میں داخل کردیگی اور یہودی حکومت یہاں قایم نہ ہونے دیں گے لیکن سوال یہ ہے کہ متحدہ اقوام کیا کرے گی۔ اگر انھوں نے کوئی بین الاقوامی فوج اس جنگ کو روکنے کے لئے بھیجدی جس کا بہت کم امکان ہے تو ظاہر ہے کہ عرب فوجیں کچھ نہ کرسکیں گی، لیکن اگر ایسا نہ ہوا اور ان دونوں کو لڑنے دیا گیا تو ظاہر ہے کہ یہ جنگ معمولی جنگ نہ ہوگی۔ یہودی گو اقلیت میں ہیں لیکن فوجی طیاری کے لحاظ سے وہ عربوں کے مقابلہ میں بہت ترقی یافتہ ہیں اور اگر تھوڑی دیر کے لئے فرض کرلیا جائے کہ عربوں نے فلسطین پر قبضہ کرلیا، تو بھی وہاں امن و سکون کا قایم ہونا بہت دشوار ہے، کیونکہ جب برطانوی فوجیں یہودیوں کی دہشت انگیزی کو ختم نہ کرسکیں، تو عرب فوجیں کیونکر کامیاب ہوسکتی ہیں — بہرحال فلسطین کا مسئلہ بڑا نازک مسئلہ ہے اور جنگ ہوجانے کی صورت میں امریکہ اور برطانیہ کے لئے بھی بڑی مشکل پڑجائے گی۔ برطانیہ کا عرب حکومتوں کے ساتھ معاہدہ ہے جس کی رُو سے وہ کس کو اسلحہ فراہم کرتا ہے، کس کو مالی مدد دیتا ہے کیونکہ بغیر اس کے نہ وہ اپنے ہوائی اڈے وہاں قایم رکھ سکتا ہے نہ عراق کے پٹرول کی حفاظت کرسکتا ہے، اس لئے کیا برطانیہ کے لئے ممکن ہوگا کہ وہ یہ امداد بند کرکے عرب حکومتوں سے بگاڑ کرے؟ — اب اسی کے ساتھ امریکہ کو لیجئے۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے یہ رائے تو دیدی ہے کہ فلسطین کی تقسیم کردیجائے اور یہودیوں کی حکومت وہاں جداگانہ قایم ہو، لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے اُن اغراض کو بھی پس پشت نہیں ڈال سکتا جو پٹرول کے سلسلہ میں مشرق وسطی سے وابستہ ہیں، اسلئے جب تک برطانیہ کی فوجیں وہاں ہیں، وہ "میرے دونوں میٹھے" والی پالیسی پر چلے، لیکن اسکے بعد اسکو ضرور فیصلہ کرنا پڑیگا کہ وہ یہود اور پٹرول میں سے کس کو اختیار کرسکتا ہے اور ہوسکتا ہے کہ اعظم پاشا مستقبل کی انھیں پیچیدگیوں سے فایدہ اُٹھائیں۔

دیوانِ ذوق میں مولانا آزاد کے اضافے

دیوان ذوق مرتبہ مولانا محمد حسین آزاد میں ہمیں دو قسم کا کلام ملتا ہے۔ ایک وہ جو پختگی سخن اور شاعری کے لحاظ سے نہایت اعلیٰ پائے کا ہے اور جس کی بنا پر ذوق کو اساتذۂ فن کی صف میں قابل عزت جگہ ملی ہے۔ دوسرا وہ ہے جس کا پایۂ شاعری چنداں بلند نہیں۔ حضرت آزاد اس کو اُستاد کے بچپن کے کلام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اُن کے الفاظ ہیں:

"ایسے اشعار اپنے کبھی کسی سے سنتے یا خود یاد آجاتے تو سناتے اور عجب محبت سے فرماتے۔ یہ ہمارا بچپن کا کلام ہے۔ نظر ثانی کریں گے۔ پھر دیوان میں داخل کریں گے اور کچھ کچھ اصلاح بھی کرتے جاتے تھے مگر والد مرحوم کے تقاضوں سے اور میری حاضر باشی سے۔ جس مسودے کو درست کر دیتے تھے۔ نئی غزل مرصع ہو جاتی تھی"۔ (دیوان ص، ۸۰)

مولانا نے ایسی غزلوں کی ابتدا میں مختصر مختصر حاشیہ دیدیا ہے جس سے وہ دوسری غزلوں سے فوراً شناخت کی جا سکتی ہیں۔ میں ان غزلوں کی فہرست یہاں درج کرتا ہوں۔ شناخت کے واسطے اُن کی ابتدا کا ایک ایک مصرع کافی ہوگا۔

(۱)	جل اُٹھا شمع نمط تار رگ جاں میرا	(ص ۸۰)
(۲)	رکھتے تھے جو کشور کسریٰ و قیصر زیر پا	(ص ۸۱)
(۳)	دشمن جاں یک بہ یک سارا زمانہ ہو گیا	(ص ۸۱)
(۴)	کوہ کے چشموں سے اشکوں کو نکلتے دیکھا	(ص ۸۲)
(۵)	بر نگ گل صبا سے کب کھلا دلگیر دل میرا	(ص ۸۳)
(۶)	اُن سے کچھ وصل کا ذکر اب نہیں لانا اچھا	(ص ۸۴)
(۷)	چاہے عالم میں فروغ اپنا تو ہو گھر سے جدا	(ص ۸۴)
(۸)	لختِ دل اور اشک تر۔ دونوں بہم دو نو جدا	(ص ۸۵)
(۹)	لعل لب و دنداں صنم کا دل نے جب سے خیال کیا	(ص ۸۵)
(۱۰)	ہجر میں کیا کیا مرض ہے سنگ دل پیدا ہوا	(ص ۸۶)
(۱۱)	رکھ دل جلوں کی خاک پہ تو با فراغ پا	(ص ۸۶)

(۱۲) تجھ کو یوسف سے کیا حسن میں برتر پیدا (ص ۴۶)

(۱۳) کوئی آوارہ تیرے نیچے اے گردوں نہ ٹھیرے گا (ص ۸۸)

(۱۴) دیوانہ ہوں تیرا مجھے کیا کام کہ لوں گل (ص ۱۲۰)

(۱۵) ہم سے ظاہر و پنہاں جو اُس غارتگر کے جھگڑے ہیں (ص ۱۳۷)

(۱۶) تمنا نہیں ہے کہ امداد دل کو تپش کا صلہ ہو کہ مژدہ قلق ہو (ص ۱۵۵)

(۱۷) جس ہاتھ میں خاتم لعل کی ہے۔ گر اُس میں زلف سرکش ہو (ص ۱۵۶)

اس غزل پر حافظ ویران نے اپنی اشاعت میں یہ حاشیہ دیا ہے:

"یہ غزل زمانۂ ابتداء سخن گوئی لکھی ہے" (صفحہ ۸۲)

(۱۸) ہاتھ سینے پہ مرے رکھ کے کدھر دیکھتے ہو (ص ۱۶۲)

(۱۹) عبث تم اپنی رکاوٹ سے منھ بناتے ہو (ص ۱۶۲)

(۲۰) جو کہوے قد یار کی تصویر دکھا دو (ص ۱۶۳)

(۲۱) دم ذبح تیغ جفا میں جب تری بہتا آب حیات ہو (ص ۱۶۴)

(۲۲) ہیں ترے رشک خط رخسار سے، (ص ۱۷۲)

(۲۳) یاں کے آنے کا مقرر قاصدا وہ دن کرے (ص ۲۱۰)

(۲۴) کوئی کمر کو تری ہو اگر کمر تو کہے، (ص ۲۱۱)

(۲۵) ملنا ہمارا اُن کا تو کب جائے جائے ہے (ص ۲۱۸)

(۲۶) قفل صد خانۂ دل آیا جو تو ٹوٹ گئے (ص ۲۲۲)

(۲۷) کس کے موشانے میں اے دست ہوس ٹوٹ گئے (ص ۲۲۳)

(۲۸) خدا نے میرے دیا سینہ لالہ زار مجھے (ص ۲۲۶)

(۲۹) مرض عشق جسے ہو اُسے کیا یاد رہے (ص ۲۲۶)

(۳۰) حد رقم سے وصف جبیں سا ہے صنم پرے (ص ۲۳۱)

(۳۱) خم ابرو ترا جب یار نظر آتا ہے (ص ۲۳۲)

(۳۲) مار کر تیر جو وہ دلبر جانی مانگے (ص ۲۳۵)

ان غزلوں کو اگرچہ مولانا کے حاشیوں کی رہنمائی میں میں نے چن لیا ہے۔ تاہم میں مطمئن نہیں ہوں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ "انتہائے کلام تو سب سے سُن چکے ابتدائے کلام آزاد سے سنو" (ص ۸۰۔ دیوان)۔ اس عبارت سے تو یہی گمان گزرتا ہے کہ

اس کے ذیل میں جو غزلیں ہیں وہ ذوق کے بچپن کا کلام ہوں گی۔ لیکن پہلی غزل کے بعد جو دوسری غزل آتی ہے اُس کو مولانا آغاز شباب کی غزل بتاتے ہیں۔ تو پھر یہ بچپن کا کلام نہ ٹھیرا۔ تیسری غزل کے واسطے کہا ہے کہ ایک مرشد زادہ کی فرمایش سے کہی تھی۔ اُنھیں گانے بجانے کا بہت شوق تھا اُسی کے لئے غزل کہلوائی تھی" (ص ۸۱)۔ بچپن یا ابتدائی زمانے میں ذوق مرشد زادوں سے کہاں تعلق میں آئے یہ اُن کے شباب کا زمانہ ہونا چاہئے، جب اُنھیں قلعۂ معلیٰ میں داخلے کی اجازت ملی ہوگی۔ چوتھی غزل کو ابتدائی مشق کہا ہے۔ پانچویں پر کوئی حاشیہ نہیں۔ چھٹی پر 'ابتدائی مشق' لکھا ہے۔ ساتویں پر خاموشی سے گزر گئے۔ آٹھویں کے لئے فرماتے ہیں کہ "نظر ثانی سے نور نہیں پایا" نویں دسویں بھی غالباً اسی مد میں داخل ہیں۔ گیارھویں پر کوئی حاشیہ نہیں۔ بارھویں کو قیس ہزاری باغ کی پیداوار بتایا ہے۔ لیکن تیس ہزاری باغ کی غزلوں کی تاریخ جو مولانا دیتے ہیں وہ سنہ ۱۲۶۰ھ ہے۔ اس سن میں ذوق چھپن برس کے ہوں گے۔ الغرض باوجود اُس تفصیل کے جو مولانا نے دی ہے ہم ذوق کے بچپن کے کلام کی شناخت سے قاصر ہیں یا ہمیں اِس اصطلاح (بچپن) میں وسعت پیدا کرنی ہوگی اور ابتدائی مشق آغاز شباب عنفوان شباب اور عالم شباب وغیرہ کو اُس مد میں شامل ماننا پڑے گا۔ اِس صورت میں فہرست بالا کی تمام غزلیں ذوق کے بچپن کے کلام میں شمار نہیں ہو سکتی ہیں۔

ایک عجیب امر یہ ہے کہ اس فہرست کی اکثر غزلیں حافظ ویران کے اڈیشن میں نہیں ملتیں چنانچہ اوپر کی بتیس غزلوں میں سے صرف گیارہ غزلوں کے ایک ایک دو دو یا زیادہ اشعار ملتے ہیں، سوائے غزل ۲۲ کے جو اُن کے ہاں بھی پوری موجود ہے۔ ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ حافظ ویران، ذوق کی خدمت میں اس قدر حاضر باشی کے باوجود ان غزلوں سے ناواقف محض ہیں۔ ذوق کے اس حصۂ کلام سے اُن کی بے خبری یقیناً حیران کن ہے۔ وہ صرف ایک غزل کو جیسا کہ سطور بالا میں دیکھا جا چکا ہے ذوق کی ابتدائی شاعری کا کلام بتاتے ہیں۔

ایک نئی بات یہ بھی ہے کہ ذوق کا یہ بچپن کا کلام سوائے بعض غزلوں کے اُس مخصوص رنگ میں نہیں ہے جس رنگ میں اُن کا باقی کلام ہے۔ اِن غزلوں کا انداز ذوق کے کلام سے بالکل مختلف ہے۔ لہٰذا ذوق کے اُس حصۂ کلام پر جس کے تنہا راوی مولانا آزاد ہیں شبہ کی گنجایش ضرور نکل آتی ہے۔ یہی نہیں، ایک اور وجہ بھی ہے جو اس سے زیادہ وزنی ہے۔ میرے پاس بعض مسودے خود حضرت مولانا کے قلم میں ہیں۔ ان کی شہادت مولانا کے نظریے کے خلاف جاتی ہے۔ اس شہادت کی رو سے، جس کی تردید میں نہیں جانتا کیونکر کی جائے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُستاد ذوق کا یہ مبینہ کلام ذوق سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا بلکہ اس کی تصنیف کی ذمہ داری حضرت مولانا پر عاید ہوتی ہے۔ میرے پاس نو کاغذ ہیں جن میں چودہ ایسی غزلیں مسودوں کی شکل میں درج ہیں ان میں مذکورۂ بالا غزلوں کے نمبر ۱۵، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲ بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ آٹھ اور غزلیں متعلقۂ ردیف یا مندرجۂ دیوان موجود ہیں۔ یہ کاغذات یقیناً نقلیں نہیں ہیں بلکہ اصل مسودے ہیں جن میں جگہ جگہ الفاظ اور مصرعوں کو کاٹا چھانٹا گیا۔ غالباً مولانا نے یہ جدید مواد دیوان ذوق کے لئے اُستاد کے بچپن کے کلام کے نام سے طیار کیا ہے۔ ان میں جیسا کہ مسودوں کا دستور ہے

بعض شعر صاف مرقوم ہیں اور بعض مصرعوں اور شعروں کی تو پانچ پانچ چھ چھ مرتبہ بلکہ اس سے بھی زیادہ قطع و برید ہوئی ہے، اگر یہ کاغذات ذوق کے خط میں ہوتے تو ذوق کے ایام طفلی کے کلام کا نظریہ بالکل درست بیٹھتا۔ لیکن وہ تو مولانا کے قلم میں ہیں اور اندرونی شہادت سے پایا جاتا ہے کہ ۱۸۸۷ء اور ۱۸۸۹ء کے مابین کسی وقت طیار ہوئے تھے۔ ان مسودوں کا وہی انداز ہے جو ایک شاعر اپنی غزل طیار کرتے وقت اختیار کرتا ہے۔ یعنے ایک ایک لفظ پر غور کرتا ہے الفاظ کو الٹ پلٹ اور جملوں میں ردو بدل کرتا ہے۔ بیان کی خوبی اور مضمون کی صفائی پر نظر رہتی ہے۔ شعر اور مصرعے کاٹ کاٹ کر لکھنے پڑتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

میں یہاں یہ عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ یہ مسودے منجملہ دیگر پرانے کاغذات کے حضرت مولانا کی ردی سے جو کچھ سال قبل آتش زدگی سے بچائی گئی تھی دستیاب ہوئے ہیں۔ حضرت مولانا کے نبیرے آغا محمد باقر سلمانی ایم، اے نے مجھے عنایت کئے ہیں۔ میں نے اُس ردی کے ڈھیر میں سے کئی چیزیں کام کی نکالی تھیں۔ خصوصاً تذکرۂ آب حیات کے تعلق میں۔ اُن میں سے آغا صاحب نے بعض کاغذ مجھے دیدئے اور بعض واپس لے لئے۔ میں نے آغا صاحب کی تحریک سے آب حیات پر اورینٹل کالج میگزین میں تنقید کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ آغا صاحب نے اُس کو پڑھ کر ناخوشی کا اظہار کیا، میں نے وہ سلسلہ جاری نہ رکھا۔ ۱۹۴۲ء میں جب میں لاہور گیا آغا صاحب مہربانی کرکے مجھ کو اپنے دولت خانہ پر لے گئے۔ یہ وہی مکان تھا جس میں مولانا آزاد رہا کرتے تھے۔ ان دنوں میری صحت بہت گری ہوئی تھی۔ مجھے آغا صاحب کے ساتھ جانے میں تامل تھا۔ ترغیب دینے کے لئے کہنے لگے کہ دادا جان کے پرانے کاغذات میں سے جو آپ پسند کریں گے دیدوں گا۔ اس پر میں راضی ہوگیا۔ اُن کے ہاں جاکر اُس ردی کے انبار کو دیکھا۔ اُس میں سے بعض چیزیں کام کی نکلیں مثلاً دو مضمون شاہ نصیر اور میر ممنون کے حالات پر، باقر حسن پرنسپل مدرسہ کالج کلکتہ کے فارسی، عربی کتب خانے کی فہرست جو خود مولانا نے اپنی لگائی ہوئی قیمتوں کے ساتھ طیار کی تھی۔ موصوف کی وفات پر یہ کتب خانہ معرض بیع میں آیا۔ مولانا بھی اس کے خریداروں میں تھے۔ چند کاغذات قدیم دہلی اور اُس کے کتبوں کے متعلق تھے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا کو اسلامی آثار قدیمہ سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔ نواب ضیاء الدین خاں بہادر کا ایک مطبوعہ قصیدہ جو دربار دہلی کے موقع پر لکھا گیا تھا۔ یک ورقی فہرستیں مطبوعۂ مصر و بمبئی۔ نیز غزلیات ذوق کے یہ مسودات زیر بحث بعض چیزیں اُنھوں نے یہ کہکر واپس لے لیں کہ ان سے آبحیات کی شہرت کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے۔ اُسوقت ان مسودوں کی اہمیت کو نہ میں سمجھا نہ آغا صاحب مجھے ورنہ مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے ان کی ہوا بھی نہ دیتے۔ مجھ کو حضرت مولانا کے ہاتھ کی تحریروں کی ضرورت تھی۔ چونکہ یہ کاغذات بھی مولانا کے قلم میں تھے اس لئے آغا صاحب نے مجھے دیدئے۔ ایک مدت کے بعد ان کاغذات کی اہمیت مجھ پر منکشف ہوئی۔ اُستاد ذوق اور مولانا آزاد دونوں ہمارے ادبیات کے آسمان کے تاباں ستارے ہیں۔ ان کے تعلق میں ہر تازہ اطلاع ہمارے سرمایۂ معلومات میں قیمتی اضافہ ہے۔ میں علمی دلچسپی کے خیال سے ان کاغذات کو شایع کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ ان کی اشاعت سے کوئی قابل قبول توجیہ اس غیر معمولی صورت حال کی بابت ہمارے ہاتھ آجائے۔ اس صورت میں سب سے پہلے میں اپنی غلطی تسلیم کرنے کے واسطے طیار رہوں گا۔ ایک امر میرے لئے موجب تاسف ہے کہ اس تحقیق و تنقید کے چکر میں آکر مجھ کو حضرت مولانا خصوصاً ان کے

پوتے آغا صاحب سے شرمندہ ہونا پڑا۔ مجھ کو پورا پورا احساس ہے کہ میں اُن کی مہماں نوازی کا صلہ کھوٹے داموں میں دے رہا ہوں۔ لیکن موقع کی اہمیت کافی عذر خواہ ہے۔ علم پرستی کا لحاظ سب سے اقدم ہے۔

اس جملۂ معترضہ سے فراغت پاکر میں اُن مسودوں کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ جب یہ کاغذات میرے مطالعہ میں آئے تو میرا پہلا خیال یہی ہوا کہ یہ اُستاد ذوق کے ہاتھ کے مسودے ہیں لیکن سیاہی اور کاغذ پر غور کرنے سے مجھے بہت جلد اپنی رائے میں ترمیم کرنی پڑی اور معلوم ہو گیا کہ یہ کاغذات مولانا کے اپنے زمانے کے ہیں۔ چھ کاغذ طالب علموں کے امتحان کی کاپیوں سے لئے ہیں۔ دو کاغذ نارتھ ویسٹرن ریلوے کی مطبوعہ فارموں پر ہیں جو جنوری ۱۸۸۸ء میں چھپی تھیں۔ ایک کاغذ ڈائرکٹر تعلیمات پنجاب کے دفتر سے مارچ ۱۸۸۸ء کی تاریخ کی مولانا کے نام چٹھی ہے۔ ہلکی اودی روشنائی میں مسودے طیار ہوئے ہیں۔

مجھے جس چیز نے سب سے زیادہ حیران کیا یہ تھی کہ ذوق کی غزلوں کے مسودے حضرت مولانا کے خط میں یہاں کیا کر رہے ہیں۔ آخر مطبوعہ دیوان ذوق میں جو مولانا نے مرتب کیا تھا ان غزلوں کو تلاش کیا۔ اُس میں تمام غزلیں بہ تفاوت قلیل مل گئیں اِدھر حافظ ویران کے مرتبہ دیوان میں پوری پوری غزلیں تو کجا اُن کا ایک شعر تک نظر نہ آیا۔ نہ تذکرہ نگار ان سے واقف ہیں۔ آخر یہ رائے قایم کرنی پڑی (خدا کرے غلط ہو) کہ مولانا نے یہ غزلیں تصنیف کر کے ذوق کے دیوان میں اضافہ کر دی ہیں اور اُستاد کے بچپن کے کلام سے انھیں موسوم کر دیا ہے۔ میں یہ رائے دیکر آخری فیصلہ اپنے ناظرین پر چھوڑتا ہوں۔ ذیل میں ان مسودات کی غزلوں کی فہرست عرض ہے۔ حوالہ صفحات مولانا کے دیوان سے ہے۔

(۱)	ہم سے ظاہر و پنہاں جو اُس غارتگر کے جھگڑے ہیں	(ص ۱۳۷)
(۲)	خدا نے میرے دیا سینہ لالہ زار مجھے	(ص ۲۲۶)
(۳)	مرض عشق جسے ہو اُسے کیا یاد رہے	(ص ۲۲۶)
(۴)	چشم قاتل ہمیں کیوں کر نہ بھلا یاد رہے	(ص ۲۲۷)
(۵)	تدبیر نہ کر فایدہ تدبیر میں کیا ہے،	(ص ۲۲۸)
(۶)	پریرو کیا ستمگر پیشتر ایسے نہ ہوتے تھے	(ص ۲۲۹)
(۷)	نہ کھینچو عاشق تشنہ جگر کے تیر پہلو سے	(ص ۲۲۹)
(۸)	برق میرا آشیاں کب کا جلا کر لے گئی	(ص ۲۳۰)
(۹)	عبد رقم سے وصف جبیں ہے صنم پرے	(ص ۲۳۱)
(۱۰)	ذکر مژگاں تیرا جس کے روبرو نکلا کرے	(ص ۲۳۲)
(۱۱)	خم ابرو ترا جب یار نظر آتا ہے	(ص ۲۳۲)
(۱۲)	دکھلا نہ خال ناف تو اے گل بدن مجھے	(ص ۲۳۴)

(۱۳) مار کر تیر جو وہ دلبر جانی مانگے (ص ۲۳۵)

(۱۴) نہ دیں گواہی جو داغ کہن نہیں دیتے (ص ۲۳۵)

سطور آیندہ میں بعض غزلوں کے مسودوں کی تفصیلی نقل دی جاتی ہے۔

غزل اول

اس غزل کے واسطے مولانا فرماتے ہیں: "عالم شباب کی غزل ہے۔ یہ بھی بادشاہ کو پسند آگئی تھی، (دیکھو صفحہ ۱۱۲) کشش کی مقناطیس بہت لگائی مگر اُستاد نے بھی نہیں ہی چھوڑی۔ حکیم احسن اللہ خاں طبیب شاہی تھے اور بڑے مقرب تھے (یہاں سے کچھ عبارت جو غیر متعلق تھی میں نے چھوڑ دی ہے) اُنھیں یہ غزل بہت پسند تھی حضور کے سامنے انہی کی زبان سے نکل گئی تھی" (دیوان ذوق طبع ۱۹۲۲ء، ص ۱۳۷)

بیانات بالا میں سے کسی ایک پر بھی مہر تصدیق نہیں لگائی جا سکتی۔ مولانا یہ غزل ذوق کے عالم شباب کی نوشتہ بتاتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ بادشاہ کو پسند تھی۔ اس حساب سے بادشاہ کی تخت نشینی کے بعد لکھی گئی ہوگی۔ یہ مان کر کہ بادشاہ کے پہلے سال جلوس (۱۲۵۳ھ) میں لکھی گئی تھی، ذوق کی عمر اُسوقت ایک کم پچاس برس کی ہونی چاہئے۔ ہاں تو یہ ان کے شیب کا زمانہ ہے نہ شباب کا۔

دوسرا دعویٰ ہے کہ بادشاہ اس غزل کو لینا چاہتے تھے مگر اُستاد نے نہیں دی، یہ بیان بھی صحت سے دور معلوم ہوتا ہے۔ اِس غزل کے مقطع میں بادشاہ پر صاف صاف حملہ ہے۔ اگر حکیم احسن اللہ خاں چاہتے بھی تو بادشاہ تک پہونچانے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔ نہ غزل ایسے اعلیٰ پائے کی ہے کہ جس کے واسطے بادشاہ اور ذوق کے درمیان رسا کشی ہوتی۔ لیکن بادشاہ مانگتے کہاں سے اور اُستاد دیتے کہاں سے جب اُس زمانہ میں اس غزل کا وجود ہی نہ تھا۔ اب جو غزل وجود ہی نہ رکھتی ہو بھلا حکیم احسن اللہ خاں اُسے کیا پسند کرتے اور حضور کے سامنے اُس کا چرچا کیا کرتے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس غزل کے مصنف خود حضرت مولانا ہیں۔ وہ اس کو لکھ کر دیوان ذوق میں شامل کر دیتے ہیں تمہید میں جو تخیل کے گل بوٹے کھینچے ہیں، اُن میں حقیقت کی بو باس بالکل نہیں۔ اس دعوے کے ثبوت میں وہی کاغذ جس پر حضرت مولانا نے اس غزل کا مسودہ اپنے خط میں طیار کیا ہے پیش کیا جا سکتا ہے۔ اسی مقصد سے اس غزل کے چار شعروں کا بلاک جن مقطع بھی آگیا ہے یہاں شامل کر دیا ہے۔

مقطع میں حضرت مولانا نے حسب معمول ظفر کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے اور ذوق کی زبان سے کہلوایا ہے کہ ذوق کی زبان سے کہلوایا ہے کہ ذوق تیرا دیوان کیونکر مرتب ہو سکتا ہے۔ عدیم الفرصتی کی شکایت فضول ہے۔ خود کردہ را درماں نیست۔ تو نے ظفر کا جھگڑا اپنے سر باندھ لیا ہے۔ گویا ذوق رات دن بادشاہ کی غزلوں کی طیاری میں لگے رہتے اور اپنی غزلیں لکھنے کی اُن کو فرصت نہ ملتی۔ لیکن ذوق اپنا دیوان ترتیب نہ دے جانے کی وجہ اپنی پریشان خاطری بتاتے ہیں۔ چنانچہ

ذوق کیونکر ہو اپنا دیوان جمع کہ نہیں خاطر پریشان جمع (ص ۱۱۶)

ایک اور موقع پر یہ شاعرانہ توجیہ پیش کرتے ہیں:

ذوق دل سوختہ دیوان لکھے اپنا کیا خاک متحمل نہیں گرمی سخن کا کاغذ (ص ۱۰۵)

مولانا بار بار ذوق کے منہ میں یہ الفاظ ڈالتے ہیں کہ "حضور کی غزلیں کہاں فرصت دیتی ہیں" (صفحہ ۱۱۰ دیوان) یہ الفاظ ذوق نے بروقت ملاقات حکیم مومن خاں سے کہے تھے، جب اُنھوں نے ذوق سے نیا کلام سُنانے کی خواہش کی تھی۔ مولانا نے "بیک تیر دو فاختہ" کے مقولے پر عمل کر کے ظفر کے ساتھ مومن خاں کو بھی کانٹوں میں گھسیٹ لیا۔ کسی اور موقع پر مومن خاں اور ذوق کی پھر ملاقات کرائی جاتی ہے اور مومن خاں کی درخواست پر کہ "کچھ ان دنوں کا کہا ہوا سنایئے مدتیں گزر گئیں آپ کے منہ سے کچھ نہیں سنا" ذوق وہی قدیمی عذر لنگ پیش کرتے نظر آتے ہیں کہ "حضور کی غزلیں فرصت کہاں دیتی ہیں" (ص ۲۰۰ دیوان)

اِدھر مولانا، ذوق کی غزلوں کی کثرت کے اظہار میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ غزلوں سے طاق بھر گیا۔ تکیے کے غلاف بھر دئے مٹکے اور ٹھلیاں اور تھیلے بھی بھر گئے (ص ۲۱ دیوان) اور ان کے تخمینے میں کہتے ہیں کہ "جو غزلیں اپنے تخلص سے کہی تھیں اگر جمع کی جاتیں تو بادشاہ کے چاروں دیوانوں کی برابر ہوتیں (ص ۲۸ دیوان)۔ کہا جا سکتا ہے کہ جب حضور کی غزلیں فرصت ہی نہ دیتی تھیں تو آخر یہ تمام ذخیرۂ غزلیات جو بادشاہ کے چاروں دیوانوں کے مساوی تھا کہاں سے فراہم ہو گیا؟ اب صورت یہ ہے کہ ذوق، مولانا کے اپنے بیان کے مطابق ظفر کے چار دیوان، معروف کا ایک دیوان، ایک دیوان کے برابر مجموعۂ قصائد اور ظفر کے چاروں دیوانوں کے برابر اپنا اظہار غزلیات، بہ الفاظ دیگر تقریباً دس دیوان لکھ چکے ہیں۔ پھر بھی حضرت کو شکایت باقی ہے کہ بادشاہ کی غزلیں فرصت ہی نہیں دیتیں۔ یہ اگر ظفر کو ناحق بدنام کرنا نہیں ہے تو کیا ہے؟ ورنہ سچی بات یہ ہے کہ ذوق کو اپنے شاگردوں کی غزلوں کی اصلاح میں جن کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز تھی بڑا وقت صرف کرنا پڑتا تھا۔ اب میں اصل مسودے کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

مسودے کا کاغذ کسی طالب علم نرنجن داس، اسکاچ مشن اسکول سیالکوٹ کے مضمون سے جس کا عنوان "تعلیم" معلوم ہوتا ہے لیا گیا ہے۔ نمبر صفحہ ۵ ہے۔ مضمون جیسا کہ امتحان کی کاپیوں کا دستور ہوتا ہے ایک طرف مرقوم ہے۔ طرف ثانی سادہ چھوٹی ہوئی ہے۔ اُس طرف مولانا اپنا مسودۂ غزل طیار کرتے ہیں۔ کاغذ انگریزی ہے۔ آبی خطوط پڑے ہیں۔ کاغذ ساز کمپنی کا نشان تاج اور اس کے نیچے بیضوی دائرے میں ایک عورت (برطانیا) ترسول لئے گدے کے سہارے بیٹھی دکھائی گئی ہے۔ ورق چونکہ بڑا تھا۔ مولانا نے شکن ڈال کر دوہرا کر لیا اور ایک ورق کے دو ورق بنا لئے۔ مسودہ ورق کی سیدھی طرف سے شروع ہوتا ہے لیکن کتابی شکل میں نہیں بلکہ بیاضوں کی طرح جن میں مصرعے اوپر تلے محرف لکھے جاتے ہیں۔ جن جن الفاظ یا فقروں پر قلم پھیرا گیا ہے، میں نے بھی تقلیداً ان پر اُسی طرح قلم پھیر دیا ہے۔ اصل مسودے کی نقل کے علاوہ اُس کے نیچے مولانا کے مرتبہ دیوان سے ہر شعر مقابلہ کے واسطے نقل کر دیا ہے۔ تاکہ دونوں کا فرق معلوم ہو جائے۔ اشعار کی ترتیب مسودے کی ترتیب کے مطابق ہے۔ مسودے اور مطبوعہ دیوان کے درمیان کی کڑی مطبع کی کاپی سمجھنی چاہیئے جس میں مولانا نے موقع بہ موقع تبدیلیاں بھی کی ہیں

صفحہ کے بالائی دائیں گوشے میں سب سے اول الفاظ "اللہ و علی" نظر آتے ہیں۔ ان کے نیچے غزل شروع ہوتی ہے۔ اس غزل کے چار شعروں کا بلاک بھی دے دیا جاتا ہے۔ افسوس ہے کہ بلاکوں میں کہیں کہیں حرف صاف نہیں یا بہت بگڑ گئے ہیں۔

اصل مسودہ ؎

ہم سے ظاہر و پنہاں جو اس غارتگر کے جھگڑے ہیں — دل سے دل کے جھگڑے ہیں نظروں سے نظر کے جھگڑے ہیں

دیوان مطبوعہ ؎

ہم سے ظاہر و پنہاں جو اس غارتگر کے جھگڑے ہیں — دل سے دل کے جھگڑے ہیں نظروں سے نظر کے جھگڑے ہیں (ص ۱۳۰)

اصل مسودہ ؎

کیا ملک فنا میں
ہی جی ~~اس ملک~~
ادھر سے

جیتے ہی جی اس دنیا میں کیا ساتھ بشر کے جھگڑے ہیں — مر کے چھٹا جبکہ چھٹا تو تو جا کے ادھر کے جھگڑے ہیں

مر کے چھٹا جب دنیا سے ادھر
~~مر کے ادھر دنیا سے چھٹا~~

دیوان ؎ جیتے ہی جی کیا ملک فنا میں ساتھ بشر کے جھگڑے ہیں — مر کے ادھر سے جبکہ چھٹے تو جا کے اُدھر کے جھگڑے ہیں (ص ۱۳۱)

اصل ؎ کیسا مومن کیسا کافر کون ہے صوفی کیسا رند — سارے بشر ہیں بندے حق کے سارے شر کے جھگڑے ہیں

دیوان ؎ کیسا مومن کیسا کافر کون ہے صوفی کیسا رند — سارے بشر ہیں بندے حق کے سارے شر کے جھگڑے ہیں

شعر ۲ و ۳ کے گوشے کی بیاض میں صفحہ کے دائیں کنارے پر لکھا ہے۔ "سر پہ سفر کے جھگڑے ہیں"۔ یہ فقرہ بطور یادداشت تحریر ہوا ہے مطلب یہ ہے کہ اس قافیے کو بھی باندھا جائے گا۔

اصل ؎ ایک ایک جور و ستم پر اس کے سو سو داغ دل ہیں گواہ — ہم جو اس سے جھگڑے ہیں حق ثابت کر کے جھگڑے ہیں

دیوان ؎ ایک ایک جور و ستم پر اس کے سو سو داغ دل ہیں گواہ — ہم جو اس سے جھگڑے ہیں حق ثابت کر کے جھگڑے ہیں

شعر ۳ و ۴ کی درمیانی بیاض میں صفحے کے کنارے "زور و زر کے" بغرض یادداشت مرقوم ہے۔ گویا اس قافیے کے باندھنے کا بھی ارادہ ہے۔ آئندہ تین شعروں کا صفحہ کی زیریں طرف سے طولاً بالائی طرف رخ ہے۔

اصل ؎ غم کہتا ہے دل میں رہوں میں جلوۂ جاناں (ں) کہتا ہے میں
جلوۂ جاناں (ں) دل میں عیاں ہے ~~عیاں ہے~~

کس کو نکالوں کس کو رکھوں یہ تو گھر کے جھگڑے ہیں — کس کو نکالوں کس کو رکھوں یہ تو گھر کے جھگڑے ہیں

دیوان ؎ غم کہتا ہے دل میں رہوں میں! جلوۂ جاناں کہتا ہے میں! — کس کو نکالوں کس کو رکھوں، یہ تو گھر کے جھگڑے ہیں

اصل ؎ مرتب کیونکر ہو[1] دیوان۔ شکوۂ فرصت کس سے کریں

~~ہو اسلوب اپنا کیا ورنہ کہاں سے فرصت ہم~~

~~ذوق مرتب دیواں اپنا[2]~~

دیوان ؎ ذوق مرتب کیونکہ ہو دیواں شکوۂ فرصت کس سے کریں

نوحہ باندھے گلے میں ہم نے اپنے آپ

~~کون پڑھے اسکو کہ یوں نامہ میں ظفر کے جھگڑے ہیں[3]~~

باندھے گلے میں ہم نے اپنے آپ ظفر کے جھگڑے ہیں (ص ۱۳۸)

اصل ؎ بحر میں گوہر پانی پانی۔ لعل کا دل خوں پتھر میں

~~پانی پانی ہو گئے موتی لعل ہیں سارے خوں بجگر~~

~~دیکھو لعل کا دل خوں ہے دیکھو~~

ہوتے لب و دنداں سے تمہارے لعل و گہر کے جھگڑے ہیں

دیوان ؎ بحر میں موتی پانی پانی۔ لعل کا دل خوں پتھر میں

دیکھو! لب و دنداں سے تمہارے لعل و گہر کے جھگڑے ہیں

~~ہوں جب سنگ ہمارے سینہ پر~~

~~ہوویں سنگ ہمارے سینہ پر~~

دوست کے گھر میں دشمن آکر ~~سنگ~~ ہوں میری چھاتی پر

دل کا ذکر ہو کیسے کرتے اب تو سر کے جھگڑے ہیں

دیوان ؎

~~دل کا ذکر رہا ہے اب کیا باقی۔ پھر~~

دوست کے گھر میں دشمن ہو جب سنگ ہمارے سینہ پر

دل کا ذکر رہا کیا باقی۔ پھر تو سر کے جھگڑے ہیں

اصل ؎ ~~کا دیکھ کے~~

~~حضرت دل نے عالم پہ عالم ہو گیا سارا میکدہ پست~~

آپ ہیں بیٹھے اور کھڑے سو سر پہ سفر کے جھگڑے ہیں

~~حضرت دل کا کیا کہوں دیکھنا عالم ہاتھ اٹھائے دنیا سے~~

دیوان ؎

حضرت دل کا دیکھنا عالم ہاتھ اٹھائے دنیا سے

پاؤں پسارے بیٹھے ہیں اور سر پہ سفر کے جھگڑے ہیں

یہ صرف نو شعر کی غزل ہے لیکن چوتھی جگہ بنظر درستی و اصلاح اس پر قلم پھیرا گیا ہے اور ہر تبدیلی پہلی تبدیلی سے بہتر و روشن تر ہے اگر اس کو مسودہ نہ کہا جائے تو کیا جائے؟ مقطع میں ظفر پر جو چوٹ ہے بالکل بے موقع ہے۔ کیا ایسی ذہنی شہادت سے اشپرنگر کے بیانہ بیان (فہرست کتب خانہ اودھ ۱۹۵۴ء) کے واسطے ظفر کے خلاف ثبوت بہم پہونچایا گیا ہے؟ (ہندستانی)

(باقی)

پروفیسر محمود شیرانی (مرحوم)

---

[1] کیونکہ ہو دیواں، بلاکسر میں بالکل غلط ہے۔ [2] دیواں اپنا، بلاک والے نے مہمل کر دیا ہے۔ [3] اس مصرع میں کون، کا، نون، اور نامہ، کا سہ، بلاک میں اڑ گئے ہیں۔

اُردو زبان

(ہندوستان و پاکستان میں)

ہندوستان کی سیاحت کرنے والوں میں چینی، یونانی، عربی و عجمی سیاحوں کے علاوہ شہر طنجہ (افریقہ) کا رہنے والا ایک سیاح ابن بطوطہ بھی خاص شہرت رکھتا ہے اور فاہین، میگستھینز، البیرونی و مسعودی کے تاریخی بیانات کے ساتھ ساتھ اس کا سفرنامہ بھی تاریخ ہندوستان کا ایک اہم باب سمجھا جاتا ہے، البیرونی کی طرح وہ حکیم نہ تھا، لیکن محدث و فقیہ، شاعر و ادیب ضرور تھا اور اس لئے اس کا سفرنامہ مذاق عامہ کے لئے بہت دلچسپ چیز ہے، یہ آٹھویں صدی کے اول میں سندھ کی راہ سے ہندوستان آیا اس وقت "دیوانۂ عالم" محمد تغلق سریر آرائے حکمرانی تھا۔

ابن بطوطہ نے منجملہ بے شمار دلچسپ مناظر و مشاہدات، روایات و واقعات کے ایک باب میں ان ہندوستانیوں کا تذکرہ لکھا ہے جو خود کو آگ میں ڈال دیتے تھے یا ڈوب کر جان دیدیتے تھے، اس باب میں اس نے ایک ایسا چشم دید واقعہ لکھا ہے جس سے ہماری زبان کی تاریخ پر بھی گہری روشنی پڑتی ہے وہ لکھتا ہے :-

"جب ان عورتوں نے جن کا ذکر میں نے کیا اپنے تئیں جلانے کا عہد کر لیا تو اس سے پہلے انھوں نے تین دن تک، گیت اور جشن، کھانے اور پینے کی مجلسیں برپا کیں گویا وہ دنیا سے رخصت ہو رہی ہیں، چاروں طرف سے عورتیں ان کے پاس آتیں، چوتھے دن کی صبح کو ان میں سے ہر ایک عورت کو ایک گھوڑا دیا گیا جس پر وہ بناؤ سنگار کئے اور خوشبو سے مہکی سوار ہوئی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ناریل تھا جس سے وہ کھیل رہی تھی اور بائیں ہاتھ میں آئینہ جس میں وہ اپنا منہ دیکھتی جاتی تھی۔ برہمن اور اس کے رشتہ دار اسکے ساتھ تھے اور اس کے آگے آگے ڈھول کے ساتھ شہنائی بج رہی تھی، اور ہندوؤں میں سے ہر شخص کہتا جاتا، کہ میرے باپ کو میرا سلام پہونچا دینا، کوئی اپنے بھائی، کوئی اپنی ماں، اور کوئی اپنے ساتھی کو سلام پہونچانے کے لئے کہتا اور وہ کہتی 'اچھا' اور ہنستی جاتی، میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ سوار ہوا تاکہ اس رسم کا تماشا دیکھوں۔

ہم لوگ تین میل کے فاصلہ پر ایک ایسی جگہ پہونچے جہاں تاریکی چھائی ہوئی تھی، اور گھنے درختوں کی چھاؤں تھی، ان درختوں کے درمیان چار قبے تھے، اور ہر قبہ میں پتھر کا ایک بت تھا۔ قبوں کے درمیان پانی کا ایک حوض تھا، جس پر درختوں کا سایہ تھا۔ درخت اس قدر گھنے تھے کہ آفتاب کی روشنی یہاں نہیں پہونچ سکتی تھی۔

جب یہ عورتیں ان قبروں کے پاس پہونچیں تو حوض پر اُتریں اور اس میں غوطہ لگایا اور جو کپڑے پہنے ہوئی تھیں ان کو اُتار کر خیرات کر دیا، پھر ان میں سے ہر عورت کو بے سیا ہوا کپڑا دیا گیا جس کو بعض نے جسم کے بیچ میں لپیٹ لیا اور بعض نے صرف سر اور شانوں سے۔ اسکے بعد حوض کے قریب ایک تنگ جگہ آگ دہکائی گئی اور اس پر تل کا تیل ڈالا گیا، اس سے آگ اور زیادہ مشتعل ہوگئی، اسی کے پاس قریب قریب پندرہ آدمی پتلی پتلی لکڑیوں کا ایندھن لئے ہوئے تھے، اور ان کے ساتھ تقریباً دس آدمی اپنے ہاتھوں میں بڑی بڑی لکڑیاں لئے تھے، اور ڈھول شہنائی والے عورتوں کی آمد کے انتظار میں کھڑے تھے، کچھ لوگ چادر سے آگ کی آڑ کئے ہوئے تھے تاکہ اس پر نظر نہ پڑے پھر میں نے دیکھا کہ ان میں سے ایک عورت جب اس چادر کے پاس پہونچی تو زور سے اس کو مردوں کے ہاتھ سے چھین لیا اور اسنے کہا "مارا می ترسانی از آتش من می دانم او آتش است رہا کنی مارا" اور وہ ہنس رہی تھی اس عبارت کے معنی یہ ہوئے کہ "ہمیں آگ سے ڈراتے ہو، ہم جانتے ہیں کہ وہ دہکتی ہوئی آگ ہے"۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ سر پر رکھا اور خود ہی آگ کے اندر چلی گئی۔ اس موقعہ پر ڈھول اور شہنائی بجنے لگی اور مردوں نے اس پر ایندھن پھینکنا شروع کیا، پھر آوازیں بلند ہوئیں اور چیخیں اُٹھنے لگیں"۔[1]

ابن بطوطہ کی اس دلچسپ روایت سے جہاں "ستی" کی رسم پر ایک بسیط روشنی پڑتی ہے، وہاں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ تغلق شاہی دور میں ہندوؤں کی عام بول چال کیا تھی، یہاں تک کہ مذہبی شعائر کے ادا کرتے وقت بھی وہ کون سی زبان استعمال کرتے تھے، عہد تغلق شاہی کی یہ عورت جان دے رہی تھی، اسوقت ظاہر ہے تکلفات ذہنی سے بالکل الگ تھی ایسے موقعہ پر بھی فارسی زبان میں اس کا مافی الضمیر جتانا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اس کی گھریلو زبان فارسی تھی اور آج سے چھ صدی قبل ہندوستان کی عام زبان فارسی تھی اور ہندوؤں نے اپنی روزمرہ کے لئے اسی کو اختیار کر لیا تھا۔

یہ واقعہ ہے کہ بعثت اسلام سے قبل ہی عرب اور ہندوستان میں باہمی تعلقات قایم ہو چکے تھے، جس کا ایک نتیجہ ہندوستان کی "ملیالم" زبان بھی ہے۔ اس کے بعد عہد اموی و عباسی میں تو عربی و ہندی اختلاط شباب کو پہونچ گیا تھا۔ عربوں نے ہندوستان سے بہت کچھ سیکھا اور پھر سرزمین سندھ میں اپنی سکونت اختیار کر کے ہندوستان کی معاشرت زبان اور تمدن پر بہت اثر ڈالا۔ یہ سلسلہ گیارھویں صدی ہجری تک برابر قایم رہا، افغانوں اور مغلوں کے عہد حکومت میں فارسی پروان چڑھی اور رفتہ رفتہ عربی اثرات گھٹنے لگے اور جو مسلمان اپنی فتوحات کا سلسلہ ایشیا، شمالی افریقہ، یورپ اور اندلس و صقلیہ تک پہونچا کر اپنی زبان اپنے تمدن اور مذاق کا سکہ بٹھا چکے تھے، ایران و ہند کی مفتوح سرزمینوں میں خود مفتوح ہو گئے۔

آپ کو معلوم ہے تیرہ سو سال گزرنے کے بعد آج نہ صرف جزیرۃ العرب بلکہ عراق و شام، مصر و الجزائر، طرابلس و مراکش کی زبانیں عربی ہیں اور گو ان کی گردنوں میں اطالوی، برطانوی اور فرانسیسی استعمار کا جوا پڑا ہوا ہے، لیکن ان کی زبان متاثر نہیں ہوئی ہندوستان کو عربوں اور مسلمانوں نے فتح کیا لیکن یہاں کے تمدن سے خود مفتوح ہو گئے عربی اثرات یہاں پھیلے، زبان نے بھی رواج پکڑا، یہاں کے علماء، رشید و مامون کے دربار میں سنسکرت کی علمی کتابوں کا ترجمہ کرنے پر مامور ہوئے، پانچویں صدی میں البیرونی نے

---

[1] رحلۃ ابن بطوطہ مطبوعہ مصر ص ۱۴ (الجزء الثانی)

یہاں کی زبان وعلوم، معاشرت وتمدن کو عربی میں منتقل کیا، ڈاکٹر نکلسن کی صوفیانہ تحقیق کے مطابق یہاں کے "یوگ" کا اثر تصوف پر پڑا لیکن پھر بھی افغان ومغل جب ہندوستان میں فارسی زبان لائے تو اس نے گہرے نقوش چھوڑے اور عربی اثرات آہستہ آہستہ بہت کم ہونے لگے، یہاں تک کہ سطور بالا میں ابن بطوطہ کی وہ اہم روایت نقل ہوچکی جس سے واضح ہوتا ہے کہ فارسی ہندوؤں کی گھریلو زبان بن گئی، قدیم تذکرے فارسی کے ہندو ادیبوں اور شاعروں سے مالا مال ہیں۔

عربی وفارسی کے انھیں اثرات نے بھاشا کے ساتھ ملکر ایک نئی زبان پیدا کی یعنی بھاشا نے عربی اور فارسی سے بہت کچھ لیکر اسے اپنا کر ہندوستان کی بسنے والی قوم کو ایک قومی زبان عطا کی، یہی ہندی ہے اور اسی کو پہلے ریختہ کہا گیا، اُردو کہا گیا اور اب اسی کے لئے صحیح اصطلاح "ہندوستانی" وضع کیگئی، اُردو کو بھاشا نے جنم دیا اور جس طرح محمد حسین قتیل، میر وزیر علی عبرتی ہندو تھے اسی طرح اُردو کے لغات میں مفردات تو عربی، فارسی سے آئے لیکن اس کا نحو وصرف ہندی رہا، گویا ہندی سرزمین میں ہندی تخم کے ساتھ عربی وایرانی تخموں کو بھی ملا دیا گیا اور اس سے ایک چمن لہلہا اُٹھا۔

ہندوؤں میں اُردو کے کتنے ماہر ادیب وشاعر پیدا ہوئے اور مسلمانوں میں ہندی وبھاشا کے کتنے افاضل وشعرا گزرے، اس کا علم بھی اب سب کو ہوچکا ہے۔ شعراء وامراء میں خسرو وآزاد بلگرامی، فیضی وبدایونی، خان خاناں، وملک محمد جائسی وغیرہ کی خدمات سے کون واقف نہیں اور سلاطین میں داراشکوہ، فیروز شاہ بہمنی وغیرہ کے ماہر ہندی ہونے سے کون انکار کرسکتا ہے۔ الغرض اُردو کی تخلیق ورواج میں ہندو مسلمان دونوں برابر کے شریک ہیں۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ہندوؤں کا زیادہ حصہ ہے، لیکن بدقسمتی سے سیاسی بیداری کے ساتھ، ساتھ ہم میں فرقہ وارانہ عصبیت بھی پیدا ہوتی رہی یہاں تک کہ اب ملک کا ایک بڑا طبقہ اُردو کو مٹا دینا چاہتا ہے اور دوسرا طبقہ ہندی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے، حالانکہ اس طرح نہ اُردو زبان کو مٹایا جاسکتا ہے اور ہندی کی ترقی کو روکا جاسکتا ہے۔

اس سے انکار ممکن نہیں بعض زبانوں میں ایک قدرتی لوچ، رس اور کشش ہوا کرتی ہے اور یہی اس کے بقا کی ضامن ہوتی ہیں، مثلاً عربی کو لیجئے کہ گو عربوں کا اقتدار ختم ہوگیا پھر بھی تقریباً ایک درجن ممالک کی قومی زبان ہے، یوروپ میں سیاسی اقتدار زیادہ تر امریکہ، برطانیہ اور روس کا ہے، لیکن جس حد تک زبان کا تعلق ہے، فرانس چھایا ہوا ہے، جس کی وجہ فرانسیسی زبان کی مٹھاس، اس کا لچیلا پن، شگفتگی اور شادابی ہے۔

اُردو جس منزل پر پہونچ چکی ہے اس کا انجام ان زبانوں کی طرح نہیں ہوسکتا جنھوں نے یونانیوں اور رومیوں کے قومی فروغ وجلال کے دامن میں پناہ لی تھی، یا آریہ اور اسرائیلی شان وشکوہ میں جن کی نشو وترقی ہوئی تھی، یونانی، لاطینی، سنسکرت وعبرانی زبانیں مٹ گئیں اب مردہ زبانوں میں ان کا شمار ہوتا ہے کیوں؟ اس لئے کہ زبان کی ترقی سیاست کی حمایت پر نہیں بلکہ اپنے قدرتی محاسن پر منحصر ہے اور اس لحاظ سے اُردو زبان نہ صرف ہندوستان بلکہ باہر بھی کافی مقبول ہورہی ہے۔

اب رہی ہندی، سو وہ مسلمانوں کے لئے بھی نفرت کی چیز ہے نہ خوف کی۔ وہ ہندی جو بولی جاتی ہے یا عام ادیب و شاعر استعمال کرتے ہیں محض خط کی تبدیلی کے باعث خالص ہندوؤں کی چیز نہیں بن سکتی۔ مسلمانوں نے ہندی میں بھی ادب و شعر کے ایسے ایسے شاہکار چھوڑے ہیں کہ آج بھی دنیا ان پر سر دھنتی ہے۔ خانخاناں کے دوہے، ملک محمد جائسی کی پدماوت، فیضی کی نل دمن، داراشکوہ کے اپنشد ایسی چیزیں نہیں جن کو ہندی ادب کی تاریخ نظر انداز کر دے۔

حصول آزادی کے بعد ہمیں توقع تھی کہ اُردو زبان کی زیادہ سرپرستی ہوگی، کیونکہ اسی زبان کے ادیبوں، شاعروں اور مصنفوں نے قومی تحریک کو اُبھارنے میں زیادہ حصہ لیا۔ لیکن افسوس ہے کہ ہماری یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔

مشرقی پنجاب، صوبہ دہلی، اودھ اور بہار میں جہاں ہندو گھرانوں میں بہت صاف اُردو بولی جاتی ہے، حکومت کا ہندی کو سرکاری زبان قرار دینا اور دیوناگری خط کو سرکاری رسم خط قرار دینا گویا یہ ظاہر کرنا ہے کہ اُردو کا تعلق یہاں کے ہندوؤں سے بالکل نہیں تھا اور یہ تاریخ کی کھلی ہوئی تکذیب ہے

جب تک بدیسی راج تھا ہڈلے، گلکرسٹ اور فیلن اُردو کی ترقی و اشاعت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے، مستشرقین اور ہندوستانی عالموں، ادیبوں اور شاعروں کی کوششوں سے یہ زبان سرحد، دکن، سندھ، بمبئی، مدراس اور بنگالہ جیسے صوبوں میں بھی بڑی تیزی سے ترقی کر رہی تھی، لیکن ملک کے آزاد ہوتے ہی سب سے پہلے یہاں کی قومی زبان ہی کو زوال آیا۔ ہندو اپنے زعم میں اُردو سے بیزاری کر کے مسلمانوں سے اپنی بے تعلقی و نفرت کا اظہار کر رہے ہیں حالانکہ اُردو تنہا مسلمانوں کی چیز نہیں بلکہ یہ تو ایک قومی سرمایہ ہے اور ہندو مسلمان دونوں پر اس کی حفاظت کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں اُردو کو مٹانے کی جو تجویزیں اس وقت مرتب ہو رہی ہیں وہ نتیجہ ہیں اس سیاسی اختلاف کا جو تقسیم ہندوستان سے پیدا ہوئے ہیں، لیکن اس سیاسی اختلاف کے معنی یہ تو نہیں ہو سکتے کہ مسلمانوں کے تمدنی تعلقات بھی ختم ہو جائیں اور اس زبان کو فنا کر دیا جائے جو ہندو مسلمان دونوں کے تمدنی تعلقات کی درمیانی کڑی ہے۔

اُردو اور پاکستان

پاکستان، ہند کا وہ علاقہ ہے جہاں اُردو نے مشرقی پنجاب، دہلی، یوپی اور بہار کی طرح مادری زبان ہونے کی فوقیت حاصل نہیں کی تھی، مغربی پنجاب کا بیشتر حصہ ابھی تک اُردو سے ناآشنا ہے یہی حال مشرقی بنگالہ اور سندھ کا ہے۔ لیکن اب پاکستانی حکومت نے اُردو کو دفتر کی زبان قرار دیدیا ہے اور اس طرح اس کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں۔

اب اسے چاہیئے کہ اُردو زبان کے محققوں، شاعروں اور ادیبوں کی خدمات حاصل کرے، اپنی مملکت کے مختلف مرکزوں میں اُردو کے دارالترجمے قایم کرے، اُردو کے اہل قلم اور اُردو اداروں کی سرپرستی کرے، شہروں اور گاؤں میں کثرت سے اُردو مدارس قایم کرے۔

اُردو کی ترقی کا بہت بڑا راز پاکستان اور یونین کے روابط میں مضمر ہے اگر واقعتاً پاکستان اُردو کا حامی و سرپرست

ہے تو اس کا فرض اولین ہے کہ انڈین یونین سے سیاسی روابط استوار کرے۔

انڈین یونین اُردو زبان کا مخزن ہے اُردو زبان کے بے شمار اہل قلم اور کثیر التعداد اخبارات و رسایل اسی مملکت سے متعلق ہیں، انڈین یونین کے ادیب و شاعر نہ کبھی ترک وطن کا خیال کرتے ہیں اور نہ اس کی ضرورت سمجھتے ہیں اس لئے جب تک دونوں حکومتوں کا میل ملاپ نہ ہوگا اُردو کا شیرازہ بکھرا ہی رہیگا ضرورت اس کی ہے کہ یہاں کی اشاعت گاہیں پاکستانی مرکزوں سے تعلق رکھیں اور دونوں مملکتوں کی ذہنی تخلیق اور ادبی پیداواروں میں مضبوط رابطہ قایم رہے۔

پنجاب ملک کا وہ حصّہ ہے جہاں ذہنی بیداری بھی بہت زیادہ ہے اور کام کرنے کی صلاحیت بھی بہت اچھی ہے ہم نے پاکستان بننے سے بہت قبل اپنے ایک مقالہ میں سجاد حیدر مرحوم کا یہ جملہ نقل کیا تھا کہ "اُردو کے دہلی اور لکھنؤ اسکول تو فنا ہوگئے۔ اب اگر اُردو کا کوئی اسکول ہے تو لاہور اسکول و دکن اسکول" (نگار مئی ۱۹۴۴ء) اس لاہور اسکول کی ترقی و ترویج میں سکھوں اور ہندوؤں کا بھی بہت بڑا حصّہ تھا، ان کی جلاوطنی کا غم مجھ جیسے بہاری کو بھی ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں ایک تلخ مگر سب سے اہم مشورہ اہل پنجاب کو یہ دینا ہے کہ وہ اپنی صوبائی عصبیت کو یکسر فراموش کردیں، اس وقت ہندوستان کے علمی و ادبی حلقوں کو اکثر یہ شکایت رہی ہے کہ اہل پنجاب سالہا سال کی ادبی و شعری مشارکت کے باوجود اجنبیت برتتے ہیں۔

پنجاب کا اکثر پاکستانی علاقہ اُردو کے پاکیزہ ذوق سے محروم ہے اس لئے پنجاب کے سرگرم کارکنوں کا فرض ہے کہ وہ ایسی فضا پیدا کریں کہ مغربی پنجاب کے ہندو اور سکھ شرنارتھی پھر اپنے وطن لوٹ جائیں، اسی طرح مشرقی پنجاب کے مسلمان مہاجرین اپنے اپنے وطن میں دوبارہ بس جائیں، یہ انسانی دردمندی کا بھی تقاضا ہے اور اس میں اُردو زبان کی حفاظت و ترقی بھی مضمر ہے۔

مشرقی پنجاب اُردو ادب کا گہوارہ رہا ہے، پانی پت کرنال، جالندھر، امرتسر میں بے شمار ایسے ہندو اور سکھ موجود ہیں جنکو اُردو ادب کا بہت ہی پاکیزہ مذاق ہے انکے ساتھ ملازمت، تجارت، تعلیم ہر باب میں فیاضانہ سلوک کیا جائے ادبی جلسوں مشاعروں اور نشر گاہوں میں انسے مشارکت کیجائے پاکستان کے دوسرے علاقہ سے رشتہ جوڑنے سے پہلے اہل پنجاب کا فرض ہے کہ اپنے ان اُردو داں پڑوسیوں کی خبر لیں۔

عبدالباری آروی

جھوٹا اشتہار دینا حرام ہے، اس سے زیادہ سچا بات کون ہوسکتی ہے، اتنا سچا آپ کا نسخہ کہ نسخہ سے

مجون عنبری یہ دوا دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کرچکی ہے دلائل اکسیر صفت ہے، جوان، بوڑھے سب کھاتے ہیں۔ اس دوا کے مقابلہ میں سیکڑوں قیمتی ادویات اور کشتہ جات بیکار ہیں، اس سے بھوک اس قدر بڑھتی ہے کہ دو تین سیر دودھ اور پاؤ بھر گھی ہضم کرسکتے ہیں، اس دوا سے بلغمی دماغ ہے کہ کبھی کی باتیں بھی خود بخود یاد آنے لگتی ہیں، اس کو مثل آب حیات کے تصور فرمایئے اس کے استعمال کرنے سے پہلے اپنا وزن کرلیجئے ایک ہفتہ کے بعد پھر وزن کیجئے ۱۵ دن کے استعمال سے جسم میں اضافہ نہ ہوگی، یہ دوا خون کو صاف کرنے کے علاوہ تمام امراض کا مقابلہ کرتی ہے، ہر قسم کے بخار، دردِ سر، دردِ شقیقہ، دردِ جگر، دردِ گردہ، دردِ مثانہ، دردِ پہلو، دردِ مفاصل، دردِ کمر، دردِ شکم، دردِ زانو، دردِ پا، دردِ ساق، دردِ ران، دردِ بازو، دردِ شانہ، دردِ گلو، دردِ دندان، دردِ گوش، دردِ چشم، دردِ سر، دردِ شکم

باب الانتقاد

روپ میری نظر میں

(مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی)

حضرت فراق گورکھپوری کی رباعیوں کا مجموعہ "روپ" میرے سامنے ہے۔ اسکی تمہید میں جس کا عنوان چند باتیں ہے اُن کا ادعا ہے کہ اُردو شاعری نے لاکھ ہاتھ پاؤں مارے مگر نہ تو فارسی شاعری بن سکی اور نہ ہندوستانی شاعری بن سکی بلکہ "کچھ عجیب الخلقت سی ہو کے رہ گئی"۔ پھر جناب موصوف اپنا شاندار کارنامہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"بچپن ہی سے اُردو شاعری میں میرا اوڑھنا بچھونا رہی ہے اور بچپن ہی سے اُردو شاعری کا دلدادہ ہوتا ہوا اُردو شاعری سے ناآسودہ رہنے کا احساس کرتا رہا ہوں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میری کوششیں خواہ غزل ہو یا نظم یا رباعی محض اضطراری چیزیں نہیں تھیں بلکہ ان کوششوں میں ہندستان اور ہندستان کے کلچر کی تھرتھراتی ہوئی زندہ رگوں کو چھو لینا چاہتا تھا"

نہ معلوم وہ کون اُردو شاعری تھی جو حضرت فراق کی تختۂ مشق رہی کیونکہ زبان کے معاملے میں، جہاں تک مجھے علم ہے، وہ لکھنؤ یا دہلی کسی کے قایل نہیں۔ حُسن اتفاق سے اس کا بدیہی ثبوت مندرجۂ بالا عبارت میں ہوتے ہوئے کی جگہ ہوتا ہوا لانا ہے۔

حضرت فراق بالکل مطمئن ہیں کہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ محض ازراہ انکسار اس امر کو مشتبہ چھوڑ دیا ہے۔ اُن کو تاسف ہے تو اس بات کا ہے کہ اُردو نے بھاشا سے تو خیر تھوڑا بہت استفادہ کیا بھی مگر سنسکرت کو ہاتھ نہیں لگایا، حالانکہ ــــ

"اُردو کو سنسکرت اور ہندی شاعری دونوں کی قدروں سے استفادہ کرنا ضروری ہے صرف بھاشا کی شاعری سے استفادہ کرنا اُردو کی شاعری کو ہندوستانی کلچر اور اُس کی روح کا صحیح نمایندہ اور آئینہ دار نہیں بنا سکتا"

لہذا جناب موصوف نے اس مجموعۂ رباعیات میں یہ کوشش کی ہے کہ:

"موقعے موقعے سے نہایت احتیاط سے سنسکرت الفاظ لائے جائیں اور اُردو کی فصاحت میں بالکل فرق نہ آنے پائے"

لیکن اور زبانوں کو بھی فراموش نہیں کیا، چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

"اس کے (سنسکرت) کے ساتھ ساتھ ۔۔۔۔۔۔ عربی، فارسی، خود اُردو، یونانی، لاطینی اور مغرب کے جدید ادب کے اُن حصوں سے جن میں آفاقی کلچر نظر آتا ہے اُردو کو مانوس ہونا چاہیے، آفاقی ادب کے لہجے کو اپنے لہجے میں جذب کرنا چاہیے اور نئے پُرانے

کسی ادب کے اُن حصوں سے بچنا چاہیئے جن میں سطحیت ہے اور جو اُس بلند سنجیدگی سے معرا ہیں جس پر ارسطو نے اتنا زور دیا ہے۔"

فراق صاحب نے کہیں وضاحت نہیں فرمائی کہ کلچر سے اُن کی کیا مراد ہے۔ یہ لفظ ہے بھی اس قدر وسیع المعنی کہ اس کے مفہوم کا صحیح تعین دشوار ہے۔ عام طور پر کلچر سے کسی سوسائٹی، سماج، ملک یا حصۂ ملک کے باشندوں یا خاص طبقوں کی مجموعی تہذیب، خصائل، روایات و معتقدات، ذہنی بالیدگی و پرداخت، تمدن و معاشرت، علمی و فنی معلومات و مشاغل وغیرہ سے مراد ہوتی ہے یا پھر لفظ کلچر کسی ملک یا قوم کی ذہنی اور علمی ترقی تک محدود ہے۔ میں فرض کئے لیتا ہوں کہ فراق صاحب نے یہ لفظ اسی مخصوص و محدود معنی میں استعمال کیا ہے۔ مگر "آفاقی کلچر" کو کیا کہا جائے؟ مجھے کسی ایسے کلچر کا علم نہیں جو تمام دنیا پر حاوی ہو، Universal ہو۔ بجز اس کے کہ ع متاع خوش بہر دکاں کہ باشد! ۔ اس کے لئے دیانتداری مقتضی تھی کہ دوسری زبانوں کی نظموں سے جو کچھ لیا جائے اس کا اعلان کر دیا جائے کہ ترجمہ ہے نہ کہ اپنا کہکر پیش کیا جائے۔ فراق صاحب نے موخرالذکر طریقہ اختیار کیا اور گرفت کی صورت میں برأت کی یہ تدبیر سوچی کہ:

"ان رباعیوں میں محض ہندو کلچر کا خمیر نہیں پڑا ہوا ہے بلکہ آفاقی کلچر کے عناصر بھی ان کے سامان آرائش ہیں۔"

اس کی مثالیں آگے ملیں گی، فی الحال اتنا ہی اشارہ کافی ہے۔

مطلب سعدی تو یہ تھا کہ جو میں نے عرض کیا اب اس کی آڑ کو جو ٹٹی گھیری ہے وہ بھی دیکھئے:

۱- یہ سچ ہے کہ خود اُردو کا بھی ایک کلچر ہے، مگر یہ کلچر ناقص ہے۔

۲- اُردو کو ہندوستانی کلچر کا صحیح نمائندہ نہیں کہہ سکتے جب تک سنسکرت سے استفادہ نہ کرے۔

۳- سنسکرت کے علاوہ اُردو کو اپنے میں دیگر ممالک کے قدیم و جدید سنجیدہ کلچر کو بھی جذب کرنا چاہیئے۔

دوسرے ممالک کو جانے دیجئے خود ہندوستان میں بیسیوں زبانیں رائج ہیں کیا ہم اُن میں سے کسی ایک کو پورے ہندوستان کے کلچر کا نمائندہ کہہ سکتے ہیں۔ کیا ان میں کوئی بھی ایسی زبان ہے جو صرف سنسکرت کو اپنا منبع فیض سمجھتی ہو، اگر ایسا ہوتا تو تامل، تلنگی، مرہٹی اور گجراتی زبانیں جاننے والے لسانی بنیاد پر ہند کے صوبوں کی تقسیم کا مطالبہ نہ کرتے۔ یہ قضیہ تازہ بھی نہیں ہے بلکہ غالباً سنہ ۱۹۲۰ء سے چلا آتا ہے۔ آرین پاتھ بابت اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء میں دیوان بہادر کے ایس رام سوامی شاستری کا ایک مضمون ہے جس کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

In the South a political party has raised its slogan — "Dravida for Dravidians" & urges the purgation of the Dravidian Culture by removing from it the Contamination due to the Aryan Culture..... These war Cries are but a few of the sounds & alarums generated by the clash of intellectual arms in modern India.

بعض محققین کا تو یہ خیال ہے کہ سنسکرت، دردیدی تہذیب کی مرہون منت ہے، اور اس کے تو بہت کم منکر ہیں کہ آریائی اور دردیدی تہذیبیں گھل مل گئیں۔ اب نہ یہ خالص ہے اور نہ وہ خالص ہے۔ اسی طرح ایرانی اور آریائی تہذیبوں کا ماخذ ایک ہے پروفیسر میکس مُلر، پروفیسر اسپائگل اور ڈاکٹر ہاگ جیسے محققین لکھتے ہیں کہ: زرتشتی شمالی ہندوستان میں بسے ہوئے تھے۔ مذہبی اختلاف پیدا ہونے کی بنا پر آراکوسیا (غالباً افغانستان کو کہتے ہیں) اور ایران کی طرف ہجرت کر گئے۔

موجودہ زمانہ میں تو کوئی خالص کلچر ہی نہیں۔ آریائی اور ایرانی، اسلامی اور ایرانی، ہندی اور اسلامی سب گڈمڈ، صرف تکنیک ہندوؤں، پارسیوں، مسلمانوں اور عیسائیوں کی الگ الگ ہے۔ فراق صاحب کی بھول ہے کہ انھیں علٰحدہ خانوں میں بند سمجھتے ہیں۔

جب اختلاف کا یہ حال ہے تو اُردو پر کیوں لے دے ہے کہ سنسکرت کی دست نگر ہو۔ یہ بھی سمجھ میں نہیں کہ فراق صاحب کے بیان کردہ اجزا کو ایک میں سمویا کیونکر جا سکتا ہے۔ فراق صاحب کو تسلیم کہ خود اُردو کا بھی ایک کلچر ہے، ناقص سہی، تو اُسے اپنے کلچر کے علاوہ دوسرے کلچروں یا کل ہندوستان کا نمایندہ بننے کی ضرورت کیا ہے، بلکہ ایسا خیال کرنا بھی خواب پریشاں سے زیادہ نہیں جب سنسکرت سی قدیم زبان ناکام رہی۔ ہمیں یہ بھی پوچھنے کا حق ہے کہ کسی ملک یا زبان کی شاعری کو اپنے کلچر کی نمایندگی کرنا چاہئے اپنے ذہنی رجحانات کی ترجمانی پر مائل ہونا چاہئے، یا ملنگے تانگے کے خیالات کو اپنے کلچر کا سرمایہ سمجھ کر جھوٹی تسلی سے خوش ہونا چاہئے۔ کیا یہ درست ہوگا کہ ہومر سے مہابھارت کے واقعات نظم نہ کرنے کا گلہ کریں اور والمیک یا تلسی داس کو اُلہنا دیں کہ اُسنے شاہنامہ کیوں نہیں تصنیف کیا؟

بات یہ ہے کہ شاعری کی دنیا واقعات و جذبات و محسوسات، یا رسم و رواج کی عام دنیا نہیں بلکہ اُس نقطۂ نظر کا بیان ہے جس سے شاعر نے اُن چیزوں کا مشاہدہ کیا یا محسوس کیا۔ بیشک اس ضمن میں وہ کلچر بھی آجاتا ہے جس میں شاعر کی ذہنی نشوونما ہوئی اور جس سے اُس کی ذات بحیثیت سوسائٹی کی ایک فرد کے وابستہ ہے، وہ آگاہی بھی شامل ہے جو خود شاعر نے مختلف علوم و فنون کے مطالعہ سے حاصل کی۔ میں مانتا ہوں کہ شاعری سے کلچر پر روشنی ضرور پڑتی ہے مگر شاعری کو کلچر کی مفصل تاریخ یا کلچر کا مخصوص نمایندہ کہنا درست نہیں۔ کلچر کا صحیح اندازہ یا تو اُس کی تاریخ کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے یا زبان کی ساخت، الفاظ کی ماہیت اور اُن کے معنی و ماخذ متعین کرنے سے کوئی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ اس تحقیق میں شاعری کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا مگر محض شاعری کو کلچر کا آئینہ دار بنانا اور معلومات بہم پہونچانے کا واحد آلہ سمجھنا ایسا ہی ہے کہ ایک معشوقۂ شوخ و شنگ سے مسائل فقہ پر تقریر کرنے کی امید رکھی جائے۔

اُردو زبان کی تاریخ، اُس کی صرف و نحو، الفاظ کی ساخت اور کینڈا، یہ سب زبان حال سے اعلان کر رہے ہیں کہ فارسی اور ہندی (بھاشا) کلچروں کے امتزاج سے وجود میں آئی (میری تحریر سے عربی اور سنسکرت کو خارج سمجھنا چاہئے۔ میرا خیال ہے کہ اُردو نے ان زبانوں سے براہ راست کچھ نہیں لیا بلکہ جو کچھ لیا فارسی یا بھاشا کے توسل سے لیا اور یوں تو شاید ہی کوئی ایسی دیسی یا بدیسی

زبان ہو جس نے اس شاہد رعنا کی مشاطگی میں تھوڑا بہت حصہ نہ لیا ہو)۔ حضرت فراق یہی نکتہ نہیں سمجھے اور آنکھیں بند کر کے اُردو پر فارسی نیز ہندی یعنی بھاشا کی ناکام تقلید کا چھدّا رکھ دیا۔ وہ بھول گئے کہ اولاد میں والدین کے خصایص ہوتے ہیں، نسلی امتیازات اور خط و خال پائے جاتے ہیں تاہم اولاد بالکل "مائی باپ" یا تامتر "ماتا" یا سراپا "پتا" نہیں ہوتی۔ یہ بھی مسلّم ہے کہ ابتدا میں گھٹنیوں چلتی ہے، تُتلا تُتلا کے باتیں کرتی ہے، جو کچھ سنتی ہے اُس کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں بغیر سوچے سمجھے نقل کرتی ہے، پھر سن تمیز کو پہونچکر اپنے لئے آپ نئی نئی راہیں نکالتی ہے۔ بھلا اُردو سی "شوخ شلیتا" جس کی "ہر ادا قہر ہے قیامت ہے" کہیں تقلید کی حلقہ بگوش رہ سکتی تھی۔ ہوش سنبھالتے ہی زبان فرفر چلنے لگی۔

اُردو کی تاریخ فلسفے کی روشنی میں پڑھئے۔ مجھے امید ہے کہ میرے معروضے کے حرف حرف کی تصدیق ہوگی۔ البتہ اُس شخص پر حقیقت کا انکشاف نہیں ہو سکتا جو قدما و معاصرین کی محنت کو ملیامیٹ کرنا اور لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر یہ دکھانا چاہے کہ اُردو کی جو کچھ خدمت کی اُس نے اور صرف اُس نے کی، باقی نے جھک مارا۔ حالانکہ اُردو شاعری کی عمر دیکھتے ہوئے کوئی ذی ہوش انکار نہ کرے گا کہ اس ناظورۂ نوخیز نے چشم بد دور حیرت انگیز ترقی کی ہے اور یہ ترقی نہ تو مسدود ہوئی ہے نہ اس کی رفتار سُست پڑ گئی ہے، ہر چند ناقدری کا یہ عالم ہے کہ "غریب کی جورو سب کی سرہنج"۔ جہاں تک اچھے اور بلند پایہ اشعار کا تعلق ہے دوسروں کے دوش بدوش خود حضرت فراق نے عروس سخن کے سنوارنے میں حصّہ لیا ہے اور اس کا سہاگ قایم رکھا ہے، تاہم یہ بھی میرا مشاہدہ تھا اور ہے کہ بسا اوقات اُنھیں اظہار خیال کے لئے مناسب الفاظ نہیں ملتے اور اُن کے اکثر آفریدگان فکر لولے لنگڑے، کانے کھدرے، یا لنجے اپاہج اور بعض تو بالکل گوشت کے لوتھڑے ہوتے ہیں جن کی بدقوارگی چھپانے یا اصالت ثابت کرنے کو نثر میں لمبے چوڑے وضاحتی نوٹ شامل کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اُن کی جدید ترین اُپج یہ ہے کہ نادان دوست کی طرح اُردو کی دھان پان پُتری کو سنسکرت کے بھاری بھاری زیوروں سے لادنا شروع کر دیا ہے۔ یہ کار روائی دم دلاسا دیدیکے پُچارے پھیر پھیر کے ہوتی ہے، غریب تڑپتی ہے، تلملاتی ہے، سسکیاں بھرتی ہے اور زیر لب کہتی ہے کہ "پھٹ پڑے ایسا سونا جس سے ٹوٹیں کان" مگر فراق صاحب کب مانتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب تک اُردو سے "بیراگ جوگن اودھو" "ہو گئے" میں نہ سُن لیں گے نہ تو خود چین لیں گے نہ اُسے چین لینے دیں گے۔

ایک سوال یہ بھی اُٹھتا ہے کہ اُردو کو دوسری زبانوں کے کلچر سے مزین کرتے وقت حضرت فراق کو یہ حاجت نہیں ہوئی کہ اُن زبانوں کے الفاظ بھی اُردو میں بجنسہٖ منتقل کر دیں مگر جب سنسکرت کی باری آئی تو یہ غدودی پیوند لگانے کی قسم کا عمل جراحی ناگزیر ہو گیا! یہ کیوں اگر سطح شعور پر نہیں تو زیر شعور سنسکرت کی "شکشا" یا تبلیغ کا جذبہ کارفرما نہیں ہے؟

جہاں تک زبان اور شاعری کا تعلق ہے اُردو کے ہر بہی خواہ کا فرض ہے کہ اس کی مقبولیت اور ترقی و ترویج کے تمام جائز و ممکن وسایل اختیار کرے۔ سنسکرت نیز دوسری زبانوں کے اسالیب بیان، خیالات و تشبیہات و استعارات لے کر اُردو میں سلیقے سے کھپائے، چشم ما روشن و دل ما شاد، مگر کسی زبان کے ایسے الفاظ اُردو میں ٹھونسنا جو اس سے میل نہیں کھاتے

دوستی کے پردے میں دشمنی ہے، زبان کو بگاڑنا بلکہ تہس نہس کرنا ہے۔ سنسکرت زربفت اور اُردو ٹاٹ سہی، زربفت کیوں ضایع کیجئے۔ ٹاٹ میں زربفت کے پیوند لگا کر آپ ٹاٹ یا زربفت کسی کی قدر و قیمت نہیں بڑھاتے۔

میری بدقسمتی ہے کہ سنسکرت علم و ادب سے بالکل بے بہرہ ہوں، لیکن انگریزی کی وساطت سے مطالعہ اور اس کے مبض شہ پاروں کا اُردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ دیکھئے کہ وہاں جمالیاتی نظریہ کیا ہے اور فراق صاحب کیا فرماتے ہیں یا کیا سمجھے ہیں اُس میں بھی عریاں نگاری ہے مگر فحاشی کی چھینٹ تک نہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جے دیو کی "گیت گوبند" کے بعض منظومات میں جو کرشن جی اور رادھا جی کی رنگ رلیوں یا معاملات عشق پر مشتمل ہیں عریاں شاعری کی جھلک دیکھ کر فراق صاحب کے منہ میں پانی بھر آیا اور نقالی کی للک اُٹھی مگر اُس لاجواب شاعری کا بھید نہ پاکر "نائکہ بھید" کی شرح لکھنے لگے! جے دیو کے آرٹ نے عریاں نگاری پر فتح پائی ہے اور فراق صاحب کی کج فہمی نے آرٹ کو فقط مجروح نہیں کیا بلکہ گھناؤنا اور شرمناک بنا دیا۔ "گیت گوبند" کی صرف ایک مثال سے اندازہ ہو جائے گا:۔ ایک موقعہ پر رادھا جی اور کرشن جی اندھیرے میں اچانک ملتے ہیں اور اجنبیوں کی طرح مواصلت ہوتی ہے صرف حرکات و سکنات اور "اسلوب" غمازی کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شاعر کا مقصود اُس کیف بے حد اور اہتزاز بے اندازہ کی مصوری تھی جو دو محرم جان بوجھ کے انجان بنکر ملنے میں محسوس کر سکتے ہیں۔ پڑھنے والے پر صناعت کا جادو چلتا ہے اور جنسی فعل کی لذتیت سے خالی الذہن ہو کر شاعر کے آرٹ اور اُس کے تجربے میں محو ہو جاتا ہے۔ کوشش کے باوجود مجھے فراق صاحب کے یہاں ایک بھی ایسی عریاں رباعی نہیں ملی جو شاعر، شاعری اور پڑھنے والے کو مسرت و سرشاری و خود فراموشی کے سنگم پر پہونچا دے ان کی ایسی رباعیوں سے بہیمی جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں یا جی متلاتا ہے اور بس! یہ آرٹ نہیں بلکہ آرٹ کی توہین ہے گو فراق صاحب کی خود فریبی اسے ترقی یافتہ عشقیہ و جمالیاتی شاعری کا خطاب دیتی ہے۔

'رس' جس کو فراق صاحب نے بدنام کیا ہے ذرا اُس کا مقصد اور منصب سنسکرت ادب کے ماہر پروفیسر دی سیتارامیا کی زبان سے سنئے:

"رس (ذوق) وہ جوہر ہے جس سے ہم صناعت کے کسی نمونہ کو جانچتے، پرکھتے اور محظوظ ہوتے ہیں، ان کی لذت ذہنی (Intellectual Pleasure) ہوتی ہے اور پڑھنے والے کو جذبات اور تناسبات کی ایسی دنیا میں پہونچا دیتی ہے جہاں وہ اپنے آپ اور گرد و پیش کے مادی مناظر سے بے خبر ہو کر وہ روحانی تلذذ حاصل کرتا ہے جو 'موکش'، یا نفس مطمئنہ سے مشابہ ہے تعینات سے گزر کر اُس کی ہستی فرد کی حیثیت سے ختم ہو جاتی ہے۔ وہ محسوسات کے مطالعہ میں ایسا کھو جاتا ہے کہ اُن کا دائرہ وسیع ہوتے ہوتے اُن آفاقی حقایق کا احاطہ کر لیتا ہے جو خود اُس کی ہستی کے بنیادی عناصر ہیں اور تھوڑی دیر کے لئے وہ خود بھی جلہ حیات اور تمام کائنات کا ایک جز بن جاتا ہے۔ صرف اُس کو سہردیہ (صاحبدل) کہہ سکتے ہیں یعنی ایسا شخص جس نے ذوق کی رہنمائی میں تربیت، فطرت اور عادت میں ایسی ہم آہنگی پیدا کر لی ہے کہ زندگی ایک حساس ساز کی طرح صناعت کا زخم کھاتے ہی نغمے بکھرانے لگتی ہے"۔

مگر اُس شخص سے کیا امید ہو سکتی ہے جو رس کو محض شربت یا زیادہ سے زیادہ جذبات کا اُبال سمجھے۔ فراقؔ صاحب کے الفاظ یہ ہیں:

"جذبات کی مختلف کیفیتوں کو سنسکرت میں رس کہتے ہیں"

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا!

اُردو نے ہر زبان سے حسب ضرورت الفاظ لئے، کسی سے کم کسی سے زیادہ، یہ درآمد بند نہیں ہوئی بلکہ برابر جاری ہے، مگر جو لفظ لیا اُس کے تلفظ یا ساخت میں حسب ضرورت تغیر تبدل بھی کیا تاکہ اجنبیت دور ہو جائے اور زبان پر آسانی سے رواں ہو۔ اُردو میں سنسکرت کے سیکڑوں "شبد" پہلے سے موجود ہیں ان میں حسب ضرورت اضافہ کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے لئے سلیقہ درکار ہے اور میرے نزدیک فراقؔ صاحب اس خدمت کے اہل نہیں وہ تو اُردو کو ایسا جنگل یا رمنا بنانا چاہتے ہیں جو بھانت بھانت کی بھیانک ہونکوں اور ڈکاروں سے گونج رہا ہے۔

اُنکے مجوزہ سنسکرت الفاظ کے چند نمونے پیش کرتا ہوں۔ انصاف سے کہئے کہ اُردو میں انکی کھپت ہے یا انکی متحمل ہو سکتی ہے؟

۱۔ گات کے لئے سُکمار۔ بقول حضرت فراقؔ "نازک دوشیزہ بدن"۔ پہلے تو مجھے دھوکا ہوا کہ دوشیزۂ نازک بدن نے کسی عجیب و غریب ترکیب مقلوب سے "نازک دوشیزہ بدن" کا روپ بھرا، پھر القا ہوا کہ "پوشیدہ غنچی" کی سند کے پیش نظر دوشیزہ بدن "کنوارا پنڈا" کی فارسی ہے۔ جب اس خلفشار سے فراغت ہوئی تو ڈکشنری سے رجوع کی تاکہ سُکمار کے معنی اور تلفظ سے آگاہی ہو۔ اسکے معنی علاوہ نرم اور نازک کے خوبصورت نوجوان کے بھی ہیں۔ گات عام طور پر کسی حصۂ جسم یا جسم کو کہتے ہیں مگر شاعری میں اس کا استعمال عورت کے سینے کے اُبھار تک محدود ہے۔ لہٰذا "سکمار گات" کے معنی کھینچ تان کے جسم نازک تو ہو سکتے ہیں مگر اس میں دوشیزگی کہاں سے آئی یہ فراقؔ صاحب جانیں۔ سُکمار کے ایک معنی نرم کے بھی ہیں اور گات کے ایک معنی عورت کے سینے کے اُبھار کے بھی ہیں، پھر سُکمار کے ایک معنی خوبصورت نوجوان بھی ہیں۔ کچھ عجب خلط مبحث ہے۔ ایک طرف اگر کسی خوبصورت نوجوان کی تعریف بزبان جرأت یوں کرتے ہیں کہ "کیا گات ہے، کیا گات ہے واللہ" تو وہ کٹار کھینچتا ہے کہ مجھے عورت بنا دیا، اُدھر کسی سندر ناری کو سُنا کر کہتے ہیں کہ "ہائے کیا سُکمار گات ہے" تو وہ نرم کے معنی لے کر خوش ہونا کیسا منہ پھلاتی ہے کیونکہ اس میں گات (سینے کے اُبھار) کی منقصت (نرمی) کا ایک پہلو ہے۔ ایسی مخلوط النسل ترکیب جیسی کہ "سُکمار گات" ہے بلند پایہ شاعری کا مارکہ نہیں ہو سکتی۔ پوری پوری رباعی درج کئے دیتا ہوں تاکہ سنسکرت داں حضرات کو فیصلہ کرنے کا موقع ملے:

الکوں کی لٹک میں سانپ کنڈلی مارے — پلکوں میں ہوں جیسے جھلملاتے تارے
سندر سُکمار گات، اوشا کی چھٹا — جوبن کے مدھ کلس پہ سورج وارے

الکوں = زلفوں ——— اوشا کی چھٹا = جلوۂ صبح ——— مندرجۂ بالا رباعی میں ایک عیب یہ بھی ہے کہ الکوں کی لٹک کی تشبیہ سانپ کے کنڈلی مارنے سے جائز نہیں۔ بندھے جوڑے سے اس کی مشابہت ہو سکتی ہے، خود فراقؔ صاحب کا ایک

مصرع اس اعتراض کی تائید کرتا ہے: جوڑے میں سیاہ رات کنڈلی مارے

۲ - نبھ منڈل - بقول حضرت فراق آکاش منڈل یا نظام شمسی - اگر ڈکشنری صحیح رہنما ہو سکتی ہے تو نبھ آسمان، فضا، کرۂ ہوا وغیرہ ہے اور منڈل حلقہ، قطر، یا کوئی ستارہ، آفتاب کی تخصیص نہیں اور نبھ منڈل کا مفہوم بالذات نظام شمسی نہیں ہو سکتا

۳ - جس بمعنی شہرت اُردو میں رائج نہیں - بمعنی طاقت پہلے سے موجود ہے مثلاً "اُن کے نک میں جس نہیں"

۴ - کُندل، بقول حضرت فراق سنہری ڈنٹھل - پلیٹس نے اپنی ڈکشنری میں فوربس اور ہیٹ کے حوالے سے اس کے معنی خالص سونا لکھ کر کہا ہے کہ غالباً اُن سے تسامح ہوا اور گندلا یا کُندن کو کُندل سمجھے، کُندل کوئی لفظ نہیں - صاحب نور اللغات نے بھی فوربس اور ہیٹ کے تتبع میں کندل لے لیا اور معنی خالص سونا لکھ دئے! مجھے شبہ پیدا ہو گیا ہے کہ فراق صاحب کی "سنسکرت بدّیا" میری طرح ڈکشنریوں تک محدود ہے - یہ عرض کرنے کی شاید ضرورت نہیں کہ اُردو نے کندلا اور کُندن دونوں کو اپنا لیا ہے لیکن محل استعمال میں خفیف سا فرق کر دیا ہے، کندن خالص سونے کو کہتے ہیں اور کُندلا سونے کے تاروں کو -

۵ - دئی بمعنی خدا - سنسکرت میں دئی کے یہ معنی نہیں بلکہ مان کا مفہوم ادا کرتا ہے، جیسے دیّا رے دیّا یا ہائے دیّا - دئی دَیا (مہربانی) کی بھی ایک صورت ہے - جیسے نردئی (ظالم یا نامہربان) - البتہ ہندی میں "دیوا یا دیو" کو دئی بنا کر خدا کے معنی دے دئے ہیں مگر فراق صاحب سنسکرت کے سر تھوپتے اور کھوج لگانے والے کو یونانی " ایرانی " داور" اور " دادار" اور نہ معلوم کہاں کہاں کنویں جھنکاتے ہیں -

۶ - ہِم گِر، ہمالیا

۷ - بیار = ہوا، یہ بھی ہندی ہے - سنسکرت باؤ - یہاں اُردو نے سنسکرت کو ترجیح دی اور باؤ نے کر مرکبات بنالئے مثلاً باؤ گولا، اور بیار کو گنواروں کے لئے چھوڑ دیا -

۸ - مُسکان = تبسم - یہ بھی ہندی ہے نہ کہ سنسکرت - ہماری نظر میں مُسکان کچھ جنچی نہیں اور اس سے ٹھیٹھ ہندی اسم مسکراہٹ بنالیا - اب مُسکان بولیں تو ہنسے جائیں -

مجھے ابھی بہت کچھ لکھنا ہے - صرف چند مثالیں اور جن میں فراق صاحب نے اُلمپس کی بلندیوں اور عرش کے کنگروں کو چھو لیا ہے

۹ - اَدھر - بمعنی ہونٹ - ڈکشنری میں اس لفظ کے ایک معنی ایسے بھی ہیں جن سے ہونٹ زیادہ گداز اور فراخ ہو کر چہرے کے بدلے عورت کے زیریں حصۂ جسم میں براجتے اور کمر سیدھی کرتے ہیں اور زیرلب کہتے ہیں کہ " مہاراجہ کوڑیا کھولورس کی بوند گرے" - "غار زہرہ" یا "مینا بازار" کے سنتری بھی یہی اَدھر ہیں، بدیسی زبان میں " Libra minora & majora " انھیں کو کہتے ہیں - اُردو کے تباض اس لفظ اَدھر اور اس کے مختلف معنوں سے نابلد نہ تھے کیونکہ اَدھر کے ایک معنی بیچوں بیچ کے بھی ہیں اس معنی میں محاورے کی صورت دے کر قبول کر لیا " نہ اِدھر میں نہ اُدھر میں، بیچ اَدھر میں" محتاط لوگوں نے اس کو اَدھڑ بھی بنا لیا اَدھر بمعنی ہونٹ سے فراق صاحب نے بڑے بڑے فائدے اُٹھائے ہیں، انتظار کیجئے -

۱۰ - یہ دیپ شکھا سی ناک ، کلیکا سے اُدھر
۱۱ - کپت ہے اساوری کہ الکوں کی لٹیں
۱۲ - کرونڑ ارس کی سرلی کوتا ہے بدن

} اُردو فریاد کرتی ہے کہ اے خدا مجھے میرے دوستوں سے بچا !

مجھے یہ کہتے افسوس ہوتا ہے کہ "روپ" کی تین سو اکاون رباعیوں میں مشکل سے دو بیسی ایسی ہوں گی جن میں شاعرانہ لطافت اور بانکپن ہے۔ باقی یا تو پوری ناقص ہیں یا کوئی جزو خام ہے اور والٹر پیٹر (Walter Pater) کے اس قول کی مصداق ہیں:

"کلاسک ادب کی ایک اپنی شان ہوتی ہے، لیکن گھٹیا شاعر اُسے بگاڑ دیتے ہیں۔ یہی حال رومانوی شاعری کا ہے۔ انوکھا پن یا نئی بات کہنے کا شوق جنون کی حد تک پہونچ جاتا ہے اور ایسے شاعر مبالغہ یا مسخرگی کی دلدل میں پھنس کے رہ جاتے ہیں"

یہ رباعیاں حضرت فراق ہی کے الفاظ میں جو انھوں نے اُردو شاعری کے متعلق استعمال کئے ہیں "کچھ عجیب الخلقت سی ہو کے رہ گئی ہیں" بقول کولرج دل و دماغ دونوں کو لباس اور نمائش پر قربان کر دیا گیا۔

پہلے چند عام نقائص کی طرف اشارہ کر دوں :

۱- رباعیوں میں حُسن قافیہ نہایت ضروری ہے، روپ کی بیشتر رباعیاں اس حُسن سے محروم ہیں۔ ایطا سے درگزر کرتا ہوں، کیونکہ فراق صاحب نے اعترافاً معذرت کر دی ہے۔

۲- (الف) - اُن کی غزلوں کی طرح اُن کی معتدبہ رباعیوں کے بعض مصرعے ناموزوں ہیں۔

(ب) - سلاست و روانی کا فقدان ہے۔

۳- اُن کی زبان پر بعض ایسے الفاظ چڑھے ہوئے ہیں جو مہذب شاعری اور سنجیدہ ادب کے لئے باعث ننگ ہیں، مثلاً انگ انگ، چمکار، جوبن (بمعنی پستان) وغیرہ۔

۴- کلام میں حشو و زوائد کی بھرمار ہے۔

۵- الفاظ صحیح محل استعمال سے دور جا پڑے ہیں یا تلفظ غلط ہے۔

اور معائب بھی ہیں جن کی تصریح میں طوالت ہے۔ مثالوں میں بعض بعض کی طرف اشارہ ملے گا۔ (باقی)

بھول نہ جائیے

کہ "نگار" کا سالانہ چندہ اب چھ روپیہ ہے اور ایک سال سے کم مدت کے لئے جاری نہیں ہو سکتا۔ منیجر

گاندھی جی

(جمیل مظہری ایم - اے)

یہ کیا ہوا کہ اندھیرا سا چھا گیا اکبار
اُداس ہوگئیں سڑکیں اُجڑ گئے بازار

بڑھا رہی ہیں عروسانِ ہند اپنا سنگار
ٹھہر گئی ہے سرِ راہ وقت کی رفتار

سکوتِ شام میں اک رنگ بیکسی کیوں ہے
یہ آج نبضِ تمدن رُکی رُکی کیوں ہے

ہوا ضرور کہیں خونِ مدعائے وطن،
کہ آنسوؤں سے ہے بھیگی ہوئی فضائے وطن

اُڑائے خاک نہ کیوں ہر طرف ہوائے وطن
کہ بوئے خون ہے پریشاں زکربلائے وطن

خبر یہ ہے کہ حقوقِ وفا کا خون ہوا
شہید ہوگئی غربت حیا کا خون ہوا

وہ آفتاب کا بجھتا ہے دھوپ ڈھلتی ہے
دھواں بلند ہے تہذیب آنکھ ملتی ہے،

چتا میں شمعِ حیاتِ وطن پگھلتی ہے
اور اس کی آنچ میں بھارت کی کوکھ جلتی ہے

پکارتا ہے زمانہ دُہائی بھارت کی
چتا میں جھونک دی کس نے کمائی بھارت کی

نثار ہوتے ہیں شعلے یہ کس کی میت پر
یہ کون ہوگیا قربان روحِ ملت پر

یہ کس کے خون کے دھبے ہیں آدمیت پر
مقامِ حیف ہے اے ہند تیری قسمت پر

بہار آتے ہی لوٹا خزاں نے باغ ترا
تری ہواؤں نے گل کر دیا چراغ ترا

مآل دیکھ سیاست کے انقلابوں کا
کہ اُٹھ رہا ہے جنازہ ہمارے خوابوں کا

ہوائے تند سے بادل گھرا عذابوں کا
سیاہ ہوگیا دن خانماں خرابوں کا

سروں سے اُٹھ گیا ظلِّ ہمائے گاندھی جی
صدائیں آتی ہیں پیہم کہ "ہائے گاندھی جی"

ہے گمرہی کو خوشی یہ کہ رہنما نہ رہا
سفر تمام ہوا خضر ارتقا نہ رہا

غروب ہوگیا سورج ہی جب سویرے سے
چلیگا زور چراغوں کا کیا اندھیرے سے

خوشا وہ بندۂ مقبول بارگاہ صمد
کہ جس کے عزم کا تکیہ رہی خدا کی مدد

جلو میں جس کے رہے ہم عنان جنون و خرد
بڑھا دی جس کے ارادوں نے ممکنات کی حد

لیا خراج عقیدت کا جس نے دشمن سے
ملا دی وقت کی رفتار دل کی دھڑکن سے

مئے محبت انسانیت کا متوالا
کہ جس نے عقل کو سانچے میں عشق کے ڈھالا

بنا کے جس نے "اہنسا" کو جنگ کا آلا
ملوکیت کا خراج کہن بدل ڈالا!

جھکا دی گردنِ مغرور کج کلاہوں کی
جھپک رہی تھی پلک جس سے بادشاہوں کی

وہ اس کا وقت کے دھارے کو موڑتے جانا
ہر ایک موڑ پہ کچھ نقش چھوڑتے جانا

عمل کے پاؤں کی زنجیر توڑتے جانا
دلوں کے ٹوٹتے رشتوں کو جوڑتے جانا

غرض! کہ آنکھ پہ پردہ جو تھا اٹھا کے گیا
دلوں کی اینٹ سے مندر نیا بنا کے گیا

یہ تیرا قرض تھا اے رہنمائے فکر امم
جھکے نہ کیوں ترے سجدے کو مظہری کا قلم

ہوں تیرے سوگ میں افسردہ کیوں نہ ہند و عجم
کہ تھا ترا دل سوزاں چراغ دیر و حرم

پتنگے مشرق و مغرب سے اڑ کے آتے تھے
متاع سوز جگر لے کے تجھ سے جاتے تھے

ترے کرم سے ہوئی شاخ آرزو تازہ
بنا ہے غیرت گلشن وطن کا شیرازہ

چھپے کی نگہت گل کیا ہوا ہے غمازہ
بہار خون کا تیرے لگائے ہے غازہ

رہیگا جانِ چمن رنگِ داستاں تیرا
ہم اپنے اشک سے سینچیں گے گلستاں تیرا

یہ مانتا ہوں کہ تو نے دلوں کو جوڑ دیا
جو سو رہی تھیں اُمنگیں اُنھیں جھنجھوڑ دیا

مگر وطن سے جو باندھا تھا عہد توڑ دیا
قریب آئی جو منزل تو ساتھ چھوڑ دیا

جو راستے میں عصا رکھ کے راہبر سو جائے
تو پھر بجا ہے یہ خطرہ کہ قافلہ کھو جائے

یہ کیا غضب ہے کہ آنکھیں چرائے جاتا ہے
ہمارے ہاتھوں سے دامن چھڑائے جاتا ہے

دلوں میں اشک کے طوفاں اٹھائے جاتا ہے
تمام اُمیدوں کو آنسو بنائے جاتا ہے

ذرا ٹھہر کہ ہمارا سلام تو لے لے
خدا کے نام وطن کا پیام تو لے لے

پیام یہ ہے کہ کب فطرتِ جہاں بدلی
ہوائے باغ نہ تحنیل باغباں بدلی

طبیعتِ دلِ اہلِ طلب کہاں بدلی
کہ تو نے پھر روشِ جورِ آسماں بدلی

اک اور لمحۂ فرصت عطا تو کرنا تھا
لحاظِ کوشش اہلِ وفا تو کرنا تھا

بھر آئیں اشک نہ کس طرح چشمِ بینا میں
کہ پھول سے بھی زیادہ ہیں خار صحرا میں

کِلے ہیں منہ پہ لہو آفتاب کا شاید
تجھے خبر نہیں شاید کہ تیری دُنیا میں

جو ڈوب جاتے ہیں سورج تو رات ہوتی ہے
خطا معاف ہو شبنم اسی پہ روتی ہے

یہ کیا کہ جیٹھ میں جب پیاس تیز ہو لب کی
تو سوکھ جائے اُسی وقت جل بھری ندی،

چڑھے جو چاند کبھی لے کے چاندنی اپنی
تو اُس کی فکر میں منڈلائے ہر طرف بدلی

اگر رہیگا ترا حُسنِ انتظام یہی
تو پھر رہیگی خدائی میں صبح و شام یہی

یہ فطرت حسد و بغض و کیں نہ بدلے گی
یہ حکمرانوں کی چینِ جبیں نہ بدلے گی،

تباہ حالوں کی قسمت کہیں نہ بدلے گی
فلک بدل بھی گیا تو زمیں نہ بدلے گی

بدل بھی جائے بظاہر تو دل نہ بدلیگا
فسادِ آب و تقاضائے گل نہ بدلیگا

تو اپنی شانِ خدائی دکھائے جا یونہیں
تجلیوں کو تماشا بنائے جا یونہیں

حقیقتوں سے نگاہیں چُرائے جا یونہیں
بنا کے خاک کے پتلے مٹائے جا یونہیں

کسی کو اپنے تلوّن سے پائیدار نہ کر
عمل کی دھن میں نتیجے کا انتظار نہ کر

مگر کہے گا یہ تجھ سے مزاجداں تیرا
اُسی پہ جورِ فلک جو ہو ترجماں تیرا

اگر رہے گا یہی دَورِ آسماں تیرا
تو ایک سجدے کو ترسیگا آستاں تیرا

ہوائیں شہر و بیاباں میں خاک اُڑائینگی
مگر کہیں بھی نشانِ جبیں نہ پائینگی

شہوانیات کیا ہے؟

منجملہ ۱۲۴ عنوانات کے چند خاص عنوان ملاحظہ ہوں :

فحاشی کی تعریف اور اسکی ابتدا ۔ شادی، طلاق و خلع ۔ مذہبی فحاشیاں ۔ فحاشی پر عمومی تبصرہ۔
استلذاذ بالمثل ۔۔۔ استلذاذ بالنفس ۔۔۔ استلذاذ بالوحوش ۔ فحاشی عہدِ قدیم میں۔
فحاشی قرونِ وسطیٰ میں ۔۔۔ عہدِ جدید اور فحاشی ۔۔۔ اخلاقِ جنسی۔

جنسی میلانات اور شہوانی خواہشوں پر اتنا جامع، تاریخی، علمی و نفسیاتی تجزیہ آپ کو کہیں اور نظر نہ آئے گا۔
حضرت نیاز کی سالہا سال کی تحقیق و جستجو کا نتیجہ ہے اور اُردو میں سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر یہی ہے ۔۔۔
حجم ۱۶۴ صفحات ۔ کاغذ سفید و دبیز ۔ قیمت علاوہ محصول چار روپیہ ۔ منیجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ۔

کلام اثر لکھنوی

عجیب بات ہے کہ جتنا اُنس مجھے لکھنؤ سے ہے، اتنا ہی اختلاف یہاں کی شاعری سے ہے۔ اُنس کیوں ہے؟ یہ بات بالکل میری ذات سے متعلق ہے اس لئے اظہار کی ضرورت نہیں، لیکن اختلاف کا سبب بیان کرنے میں مجھے کوئی تامل نہیں، اور بارہا اس کو تفصیل سے ظاہر کر چکا ہوں۔

اس میں کلام نہیں کہ جس حد تک زبان کی صفائی، محاورات کی برجستگی اور الفاظ کی تراش خراش کا تعلق ہے لکھنؤ کو دہلی پر فضلیت حاصل ہے لیکن شاعری غالباً ان تمام باتوں سے علٰحدہ کوئی اور چیز ہے، جو ناسخ ایسے خشک و بے نمک کہنے والے کو بھی "متقدمیر" بنائے بغیر نہ رہ سکی۔

کہا جاتا ہے کہ ایک قوم کی شاعری اس کے تمدن کا آئینہ ہے۔ اس لئے اگر قدیم اودھ کے تمدن کا حال معلوم کرنا ہے تو اُسوقت کی شاعری کو دیکھو۔ کامرانیوں کا دور تھا، رنگینیوں کا زمانہ تھا، عیش و نشاط کی حکومت تھی، حُسن کی نیرنگیاں تھیں، جوانی کی سرمستیاں تھیں اور پھر لطف یہ کہ غالب کی طرح نہ کسی کو "حسرتِ تعمیر" کا رونا تھا اور نہ "آشتیِ چشم و گوش" کا شکوہ، بلکہ "چشم وا کردن زمیں تا آسماں آغوش داشت" حُسن، عشق کی آغوش میں مچل رہا تھا، اور عشق زیبایش حُسن کے مطالعہ میں مصروف، ہر عاشق کا دل اس کے سینہ میں تھا اور ہر سینہ پر محبوب کا دستِ نازک تسکین بخش پھر اس دورِ دلنوازی میں شراب نہ لنڈھائی جاتی تو کیا خونِ دل پیا جاتا، گل افشانی نہ ہوتی تو کیا اشک فشانی کیجاتی یہ رنگ رلیاں لکھنؤ میں نہ ہوتیں، تو کیا دہلی میں ہوتیں جہاں سلطنت مٹ چکی تھی، بساطِ عیش اُلٹ دیجا چکی تھی۔ اور بزم کی آخری یادگار صرف ایک ظفر کی ہستی رہ گئی تھی اور اس کا بھی میرزا کی زبان میں یہ عالم تھا کہ

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی　　اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

یہ درست ہے کہ حزنیہ (Pessimistic) شاعری مفید نہیں لیکن طربیہ (Optimistic) دور کی شاعری بھی بجائے جذبۂ حماست و قومیت کے صرف رقص و نغمہ پیدا کرنے والی ثابت ہو تو اسے کیا کہیں گے؟

اگر میر کی آہ آہ ایک قوم کو پست کرنے والی ہے تو ناسخ کی واہ واہ بھی زوال ہی کا درس ہے کیونکہ ملک و قوم کی ترقی نہ سر پکڑ کر رونے رہنے میں ہے نہ کمر پر ہاتھ رکھ کر ناچنے میں، اس لئے ہماری شاعری خواہ وہ لکھنؤ کی ہو یا دہلی کی "افادیت" کے لحاظ سے کوئی مرتبہ نہیں رکھتی لیکن نفسیاتی نقطۂ نظر سے ضرور قابل مطالعہ ہے اور اس نقطہ پر پہونچکر ایک نقاد کی نگاہیں بے اختیار میر و درد کی طرف اُٹھ جاتی ہیں اور ناسخ و آتش کا خیال بھی ذہن میں نہیں آتا۔

یہ تھا اولین دور لکھنوی شاعری کا جو سلطنت اودھ کے ساتھ قایم رہا اور جس طرح موسم بہار کے بعد طیور کی نغمہ سرائیاں بند ہو جاتی ہیں، اسی طرح جانعالم پیا کے لکھنؤ چھوڑنے پر لکھنوی شاعری کے چوچلے بھی مٹنے لگے۔ لیکن چونکہ طبائع اس رنگ کے خوگر ہو چکے تھے، اس لئے ظاہر ہے کہ دفعتہً اس کا محو ہو جانا ممکن نہ تھا شمع ہر چند گل ہو چکی تھی لیکن لگن کی خاکستر میں ہنوز گرمی باقی تھی۔ چنانچہ شاعری میں کچھ انقلاب ہوا، لیکن صرف اس قدر کہ پہلے جو جذبات شباب آسودہ نظر آتے تھے۔ اب ان میں اضمحلال سا پایا جانے لگا اور وصل و کامرانی کی عریانیوں پر ایک حجاب تنک پڑ گیا، گویا رات کی بادہ خواری کا خمار صبح گاہی تھا جس میں نشہ کی کیفیت کم اور کسل و تکان کی زیادہ تھی۔ رفتہ رفتہ یہ حالت بھی دور ہوئی اور حزن و ملال شروع ہوا، لیکن چونکہ صحیح کیفیات عشق سے یہاں کی شاعری کبھی آشنا نہ ہوئی تھی، اس لئے حزن و ملال میں زیادہ تر رنگ ماتم و سینہ کوبی کا تھا عیش ماضی پر سر دھننے کا تھا اور عاشقانہ ضبط و تحمل یا والہانہ بیانِ مہجوری سے اسے کوئی سروکار نہ تھا، اسی لئے یہاں کے شاعر پر عالم نزع تو جلد جلد طاری ہونے لگا کیونکہ انسانی زندگی میں اس سے زیادہ المناک واقعہ اس کے نزدیک کوئی اور نہ ہو سکتا تھا لیکن مر مر کے جئے جانے کی توفیق اسے کبھی حاصل نہ ہوئی۔ زمانہ گزر گیا، حالات بدلتے رہے یہاں تک کہ علوم جدیدہ کی ترقی نے ملک کی دوسری زبانوں کے ساتھ اُردو کے سامنے بھی ایک جدید دور نہضت پیش کیا اور لکھنوی شاعروں نے بھی زبان سے نہ سہی لیکن دل میں ضرور اعتراف کیا کہ صحیح تغزل وہی ہے، جس کی بنیاد کسی وقت دہلی میں پڑی تھی لیکن اب اس کی یادگار وہاں کوئی باقی نہ تھی، پھر یہ بھی فطرت کا عجیب کرشمہ ہے کہ وہی سرزمین جہاں تغزل کا معیار میر و درد کا کلام سمجھا جاتا تھا۔ وہاں سائل و بیخود ایسے شاعر پیدا ہوئے اور لکھنؤ جہاں کی شاعری کا ابوالآباء ناسخ ایسا شاعر ہو وہاں آرزو، صفی عزیز اور اثر ایسے غزلگو شاعروں کا نشو و نما ہو۔ یہ حد ہے دہلی کی ویرانی کی اور انتہا ہے لکھنؤ کے شاعرانہ ردِ عمل کی۔

اخیر میں مجھے اس قدر اور عرض کرنا ہے کہ یہ "انتخاب اشعار" میرا ہے اور اس لئے اگر معاملہ "رسوائی" کا آپڑے تو تنہا مجھی کو اس کا ذمہ دار قرار دیا جائے، جناب اثر کو اس میں شامل کرنے کی ضرورت نہیں۔

نیاز فتحپوری

جن خیالات سے ہو جاتی ہے وحشت دونی — کچھ انھیں سے دل دیوانہ بہلتے دیکھا

کیا حسرت دیدار ہے ہر بار یہ سمجھا — گویا کبھی دیدار میسر نہ ہوا تھا

پوچھا اثر سے میں نے جو دل کا معاملہ — اک آہ سرد کھینچ کے خاموش ہو گیا

جو سانس ہے رکی ہے جو آنکھ ہے لڑی ہے — چھیڑا یہ آج کس نے افسانہ بیخودی کا

وہ گذرا ادھر سے جو بیگانہ وار — چراغ لحد جھلملانے لگا،

اپنی وفا نہ اُن کی جفاؤں کا ہوش تھا — کیا دن تھے جبکہ دل میں محبت کا جوش تھا

لے لیا دل مڑ کے نہ دیکھا ادھر — جاؤ تمھارا ہی بھلا ہو گیا،

صیاد نے چھوڑا وہیں افسانۂ گلشن — جب قصد اسیروں نے کیا ترکِ فغاں کا

کوئی موسم ہو، سماں ہو، کہ تغیر ہو کوئی
تم کو جب دیکھ لیا وقت فراموش ہوا،

تم نے پوچھا اس طرح حال دلِ خانہ خراب
یاد اب کچھ بھی نہیں، اب تک بہت کچھ یاد تھا

یہ بھی نصیب، مایل پرسش وہ جب ہوئے
جو میرا مدعا تھا مجھی پر عیاں نہ تھا

یہ اتفاق تو دیکھو، بہار جب آئی
ہمارے جوش جنوں کا وہی زمانہ تھا

ہوا میں کچھ دھواں سا اُٹھ کے فوراً پھیل جاتا ہے
قفس میں یاد جب آتا ہے میرا آشیاں مجھ کو

میں اب سجدے کروں، دل کو سنبھالوں یا بڑھوں آگے
نظر آتا ہے کوسوں سے کسی کا آستاں مجھ کو

ہم نے رو رو کے رات کاٹی ہے
آنسوؤں پر یہ رنگ تب آیا

فریاد کا شنوا کوئی نہیں، بیکس کا سہارا کوئی نہیں
کچھ دیکھ لیا اس دنیا میں، کچھ حشر میں دیکھا جائے گا

میں نے کہا کچھ نہیں لے لے قسم ہمنشیں
آپ ہی کچھ زیر لب کہہ کے خفا ہو گیا

چمن ہے، شاخ گل ہے آشیاں ہے، پھر نہیں کچھ بھی
غضب ہے طائر آزاد کا بے بال و پر ہونا

کبھی رشک نے سمجھنے نہ دیا کہ بیوفا ہے
وہ کسی سے وعدہ کرتا، مجھے اعتبار ہوتا

اب یہ سودا ہے کہ حاصل ہوش میں آنے سے کیا
کہدیا اُن مدبھری آنکھوں نے دیوانے سے کیا

چہرے کا رنگ دیکھئے آئینے میں اثر
کہنے چلے ہیں دردِ دل اس بیوفا سے آپ

بھولنے والے سے کوئی پوچھتا
میں تجھے دل سے بھلاؤں کس طرح

آہ کس سے کہیں کہ ہم کیا تھے
سب یہی دیکھتے ہیں کیا ہیں ہم

حیف تمھیں فرصت ہی نہیں ہے ورنہ کیا کیا حسرت تھی
حال ہمارا کچھ سن لیتے، کچھ حال اپنا سناتے تم

وضع بھی کوئی شے ہے آخر، دل کو اثر سمجھانا تھا
در سے کسی کے اکبار اُٹھکر، کاش دوبارہ نہ جاتے تم

اس نے کس لطف سے پوچھا کہ اثر کیسے ہو
بیخودی کا ہو بُرا کہہ دیا کچھ یاد نہیں،

محبت اور اظہار محبت
یہی تو بات ہے دیوانے پن میں

وہ آئے حال پوچھا اُٹھ گئے کب کے خفا ہو کر
میں اب تک یہ سمجھتا ہوں مرے پہلو میں بیٹھے ہیں

کبھی تھا پاس ناموس محبت اب یہ حسرت ہے
کسی کو راز داں کرلیں، کسی کو ہمزباں کرلیں

کہتے ہیں حال اثر اب نہیں دیکھا جاتا
کوئی حیلہ پئے تجدید ستم ہو کہ نہ ہو

نظر سوئے زمیں ہے، گوشۂ دامن ہی ہاتھوں میں
معاذ اللہ کوئی کیا سمجھے ایسے پشیماں کو

دل وہی دل ہے کہ جس کی زندگی ہو اضطراب
غم وہی غم ہے کہ تم سے بھی مسیحائی نہ ہو

ایسی صورت کوئی اے دیدۂ تر ہو جائے
دل پہ جو گزرے انھیں اس کی خبر ہو جائے

آستاں بوسیٔ دلدار نہیں قسمت میں — آؤ اک سجدہ سرِ راہگزر ہو جائے

تکیہ کلام ہی سہی، رشک سے مر رہا ہوں میں — کیوں کہوں بات بات پر دیکھو بھلا سا نام ہے

پھر تمھیں فرصت نہ ہو یا میں ہی آپے میں نہ ہوں — یہ بتاتے جاؤ میرے حق میں کیا منظور ہے

دیکھو نہ آنکھ بھر کے کسی کی طرف کبھی — تم کو خبر نہیں جو تمھاری نظر میں ہے

جھلملاتے ہوئے تارے کیا ہیں — بلکتے پھول ترے بستر کے

تم ابھی کچھ تھے ابھی ہو کچھ اور — دیکھ لینے دو ذرا جی بھر کے

ہنگامۂ ہستی کی بس اتنی حقیقت تھی — اک موج تھی جو اُٹھکر پھر مل گئی دریا سے

بسمل کہ نیاز میں وہ بھی گناہ ہے — اک اضطراب شرح تمنا کہیں جسے

سخن نا آشنا رکھا کسی کی بزم میں مجھ کو — کبھی تہذیب مجلس نے کبھی ترتیب محفل نے

وہ میں نہیں رہا ہوں وہ دل نہیں رہا ہے — کیوں چھیڑئے کہ رونا بے اختیار آئے

شکوے تھے صرف لذّت گفتار کے لئے — من جاؤ روٹھتے نہیں بیکار کے لئے

آتا ہے ایک رنگ تو جاتا ہے ایک رنگ — لو آئے تھے وہ پرسشِ بیمار کے لئے

وہ بیوفا ہیں، کہ ہم بیوفا، خدا جانے — حیات ختم ہے اور ان کی آمد آمد ہے

ایک سجدے سے زیادہ عشق میں جائز نہیں — ورنہ آلودہ جبینِ بندگی ہو جائے گی

اس قدر بے اعتباری پر ہے اتنا انتظار — بیوفا یہ تیرے وعدے میں عجب تاثیر ہے

اک روز دل میں تیری محبّت تھی جاگزیں — اب تو ہی تو ہے تیری محبّت نہیں رہی

میں کیا سُناؤں درد محبّت کا ماجرا — حد ہو گئی کہ تم سے شکایت نہیں رہی

وہ بدگماں ہیں میری خموشی سے اور میں — مرتا ہوں حرفِ شوقِ مکرر لئے ہوئے

اچھا ہوا غش کھا کے گرے حضرت موسیٰ — اب ہوش میں رہنے کا تو الزام نہیں ہے

ہوش رہتا ہے بس اتنا دمِ تحریک جنوں — جیسے چھینے لئے جاتا ہے گریباں کوئی

خاکستر پروانہ میں بھی آگ دبی ہے — اے بادِ صبا دیکھ کے دامن کو ہوا دے

کچھ ہوش میں آنے کی مرے شکل بھی ناصح — یہ میں بھی سمجھتا ہوں مجھے ہوش نہیں ہے

آیا تھا کچھ خیال کہ دُنیا بدل گئی — کیا شرح بے ثباتی دُنیا کرے کوئی،

یہ حال ہے کہ کچھ نہیں آتا نظر مجھے — اے شوقِ دید اب نہ پھرا در بدر مجھے

قاصد پیام ان کا نہ کچھ دیر ابھی سُنا — رہنے دے محوِ لذّتِ ذوقِ خبر مجھے

ہنستے روتے کاٹ دیجئے زندگی کے چار دن
درد دل کہئے کسی سے اور نہ درماں چاہئے

بہار ہی میں جو بجلی گرے تو گرنے دو
بچائے میری بلا آشیاں خزاں کے لئے

وہی ہیں اس کی جفائیں وفا کے پردے میں
اگرچہ میں نے شکایت کی اور اکثر کی

وعدہ تو کرلے بے وفا، حشر سہی، کہیں سہی
ہر گھڑی انتظار کی پھر دم واپسیں سہی

لہو بدن میں رہا اور نہ آنکھ میں آنسو
اب اس کے بعد گلہ تھا اگر دعا کرتے

جو کہا جائے وہ کیا جائے
تم یہ کہتے ہو، کیا کہا جائے

سعی ناکام اب اجازت دے
کسی گوشے میں مر رہا جائے

دل مجھے سنبھالے تھا دل کو میں سنبھالے تھا
ناگہاں ہوا آئی جانب گلستاں سے

کوئی تو شفق سمجھا، کوئی گرد رنگ آلود
دور اثر بہار اتنی گزری اہل زنداں سے

کچھ قیامت ہی پہ موقوف نہیں ظاہر ہے
تم جہاں ہوگے وہاں حشر کے ساماں ہوں گے

اس پہ کیا گزری، ٹھہر کر یہ بھی دم بھر دیکھئے
آپ جس کو دیکھئے اور آنکھ بھر کر دیکھئے

دلِ خراب کی تسکیں کو منہ سے کچھ کہدو
نظر سے مل نہیں سکتی اگر نظر، نہ سہی

وفا کی قدر نہ ہو، تو اگر جفا نہ کرے
کسی کے بس میں کسی کا ہو دل، خدا نہ کرے

کسی نے اثر شکل منزل نہ دیکھی
یہ سودائے منزل فسونِ جرس ہے

جب کہا اس نے مدعا کہئے
سوچتے رہ گئے کہ کیا کہئے،

اب یہی ہے نباہ کی صورت
ناسزا سنئے مرحبا کہئے

ادب لاکھ تھا پھر بھی اسکی طرف
نظر میری اکثر بہکتی رہی

اگر ہونٹ سی بھی لئے، کیا ہوا
نگاہوں سے الفت ٹپکتی رہی

نہ چھیڑئے گا، نہ بولئے گا کہ اب ہے، کچھ دنسے اور عالم
جسے رلاتے تھے آپ ہنسکر اثر وہ پہلا اثر نہیں ہے

یہ جوش نامرادی ہے یہ رنگ بیقراری ہے
کہ تیرے وعدے سے بھی دل کی اب تسکیں نہیں ہوتی

خوشا طالع، زہے حال خراب آج اُسنے فرمایا
محبت سب کو ہوتی ہے مگر ایسی نہیں ہوتی

دور سے گاہ گاہ، ایک نگاہ
اس کو بھی مدت مدید ہوئی،

دل غمدیدہ کانپ کانپ اٹھا
یاس کے بعد جب امید ہوئی

وہ تراشباب کہ الحذر، وہ تراخرام کہ الاماں
نہ یہ رنگ چھلکے بہار سے، نہ یہ کیف ٹپکے شراب سے

وہ فروغِ جامِ صفائے دل، کہ ضیائے مہر بھی ہو خجل
تمھیں سابقہ ہی رہا نہیں کسی رندِ بادہ خراب سے

شبِ انتظار گزر گئی، خلش انتظار کی ہے وہی
بھری نیند ہو مری آنکھ میں، مگر آنکھیں ڈرتی ہیں خواب سے

رونے سے اب نہ روکو بے اختیار ہیں ہم
کیوں تم نے اشک پونچھے اور اپنی آستیں سے

عنوان مختلف ہوں، پیغام ایک ہی ہے
حیران ہے چشمِ بینا بیکار کفر و دیں سے

پھر اثر ہیں اور تو جبہہ سم
پھر بڑھا ربط اس بت عیار سے

حیف نہ آئے، تم نے نہ دیکھا تاروں کی آنکھ جھپکتی رہی
نوکِ مژہ پر آخر شب تک بوند لہو کی جھلکتی رہی

مژہ نمدیدہ، چہرہ زرد، لب خشک
اثر پندارِ خود داری کہاں ہے،

گلشن سے پیام آتے ہی رہے، گل پھول کھلے مرجھا بھی گئے
دیوانہ تو آخر دیوانہ، نکلا نہ قدم ویرانے سے

مری بات نہ بھول کے پوچھی کبھی، مرے حال پہ تیری نظر نہ ہوئی
ترے ملنے کی نکلی نہ راہ کوئی، مری شامِ الم کی سحر نہ ہوئی

دل ہی اثر کا تاب نہ لایا،
ورنہ محبت زہر نہیں ہے

اب آئے بہار یا نہ آئے
آنکھوں سے لہو ٹپک رہا ہے

کس نے وحشی اثر کو چھیڑا
دیوار سے سر پٹک رہا ہے

دیکھنا شوخی کہ مجھ کو یاد تو کرتا نہیں
بزم میں خالی ہے لیکن میری جا میرے لئے

جیسے گل اپنے تھے، اپنا باغباں، اپنی بہار
آہ وہ پہلے پہل کی پرفشانی کے مزے

لاکھ روکا نکل پڑے آنسو
وہ کڑی چوٹ دلپہ کھا بیٹھے

نہ سنانا تھا جس کو آج اس کو
ماجرائے الم سنا بیٹھے

دھیان کس سے لگا ہوا ہے اثر
سوچتے رہتے ہو یہ کیا بیٹھے

کیونکر کہوں کہ ختم ہوا دورِ انتظار
آنسو کی ایک بوند ابھی چشمِ تر میں ہے

محرومیٔ پیام کا حاشا گلہ نہیں
سب دلکشی خبر ہی کی ذوقِ خبر میں ہے

بارے جنوں کے جوش میں کچھ تو کمی ہوئی
مدت کے بعد آج اثر اپنے گھر میں ہے

اس چشمِ سخن گو کی باتوں میں اثر آکر
دل مفت گنوا بیٹھا سنتے تھے کہ دانا ہے

کیا کیا اے سکوتِ نامرادی کیا کیا
رو دئے ہنستے تھے جو مجھ کو رُلانے کے لئے

میرا کہنا مان اے حسنِ پشیمانِ ستم
اب محبت کر محبت آزمانے کے لئے

کچھ روز یہ بھی رنگ رہا انتظار کا
آنکھ اُٹھ گئی جدھر بس اُدھر دیکھتے رہے

ہے ہے وہ ضبطِ شوقِ نظارہ دمِ اخیر
دل چاہتا کدھر تھا کدھر دیکھتے رہے

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنہ، علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:-

۱ چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲ مادیئن کا مذہب

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حُسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوشخط سرورق رنگین

قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

فراست الید

مولفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری شہرت و ننگ نامی پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے، ایک بار اس کو شروع کردینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت ڈیڑھ روپیہ

علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت و علماء کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کے لئے کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

انتقادیات (دو حصے)

حضرت نیاز فتحپوری کے انتقادی مقالات جو دو حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں، پہلے حصہ میں وہ مقالات ہیں جن میں خاص خاص شعراء کے کلام پر تنقید کی گئی ہے، مثلاً:- مومن، ظفر غالب، مصحفی، نظیر، سیماب، جوش، اصغر وغیرہ وغیرہ، دوسرے حصہ میں عام ادبی و انتقادی مباحث ہیں جن کا تعلق شعر و ادب کی تاریخ سے ہے۔

قیمت حصۂ اول للعہ۔ حصۂ دوم للعہ

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور یہ دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔

اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنے رکھتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کردینے والی

انجیلِ انسانیت

"من و یزداں"

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دورِ تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ۔ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کرکے تمام نوعِ انسانی کو بالخصوص ہندی برادران وطن کو اسلام کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے ــــ اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقاید و رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پُرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے ــــــــ ضخامت ۶۷۲ صفحات۔ مجلد۔ قیمت سات روپیہ آٹھ آنہ (بیرنگ) علاوہ محصول

"نگار" کے خاص نمبر

جنوری سنہ ۳۹ء
(مصحفی نمبر)
اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:- حیاتِ مصحفی - اُردو غزلگوئی میں مصحفی کا مرتبہ - مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں، انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ
قیمت دو روپیہ، علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۰ء
(نظیر نمبر)
اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:- نظیر کا مسلک شاعری پر تبصرہ
نظیر اور عوام
انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۱ء
یہ نمبر دنیائے تذکرہ میں بالکل پہلی چیز ہے - یعنی اس وقت کے تمام مشہور غزل گو شعراء نے خود اپنے حالات لکھے ہیں اور خود اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے -
قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۲ء
اس نمبر میں ملک کے پانچ مشہور نقادوں نے اُن شاعروں کے کلام پر تبصرہ کیا ہے جن کی غزلوں کا انتخاب جنوری ۴۱ء میں شایع ہوا تھا -
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۳ء
اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی -
قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۵ء
(قرآن نمبر) اس میں ڈاکٹر اسٹڈل کے اُن اعتراضات کو پیش کیا گیا ہے جو ماخذ القرآن کے عنوان سے کئے گئے ہیں - حضرت نیاز کے فٹ نوٹ اور استدراک کے ساتھ ——— قیمت دو روپیہ علاوہ محصول -

جنوری - فروری مارچ سنہ ۴۶ء
یہ سالنامہ دو حصّوں میں شایع ہوا ہے اور فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے - پہلا حصّہ جنوری کا ہے اور دوسرا حصّہ میں فروری، مارچ دونوں نمبر شامل ہیں - قیمت ہر حصّہ کی ایک روپیہ آٹھ آنے

جنوری سنہ ۴۷ء
اس سالنامہ کا نام "ماجدولین نمبر" ہے جس میں ایک بے مثل فرانسیسی ادیب کی ایک شاہکار ٹریجڈی کو اُردو میں منتقل کیا گیا ہے - ادبیت و جذبات نگاری کے لحاظ سے یہ ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا ——— قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے - علاوہ محصول -

جنوری، فروری سنہ ۴۸ء
(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر - جس میں دُنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقایق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے ذرّیں زریں اور اُن کارناموں کو نہ بھول جائے جن پر مسلم حکومتوں کی ترقی کی بنیاد قایم ہوئی تھی - تمام مقالات اڈیٹر کے قلم کے ہیں ——— قیمت تین روپیہ ——— علاوہ محصول -

نرخنامہ اُجرت اشتہار

ایک سال	چھ ماہ	تین ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ ۶۰۰ روپیہ	۳۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۵۰ روپیہ
آدھ صفحہ ۳۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۷۵ روپیہ	۲۵ روپیہ
چوتھائی صفحہ ۱۵۰ روپیہ	۷۵ روپیہ	۴۰ روپیہ	۱۴ روپیہ

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر چھ روپیہ - ششماہی جاری نہیں ہو سکتا - سالانہ بیرون ہند بارہ روپیہ

(نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ تک شایع ہوتا ہے اور ۱۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے ورنہ پھر کسی طرح نہیں مل سکتا - "منیجر"

کمیشن وغیرہ کی مزید تفصیلات اور قواعد طلب کیجئے - "منیجر"

جواب کیلئے ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے اور خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے

مطبوعہ مختار پرنٹنگ ورکس لکھنؤ (پرنٹر و پبلشر - ایس حسین)